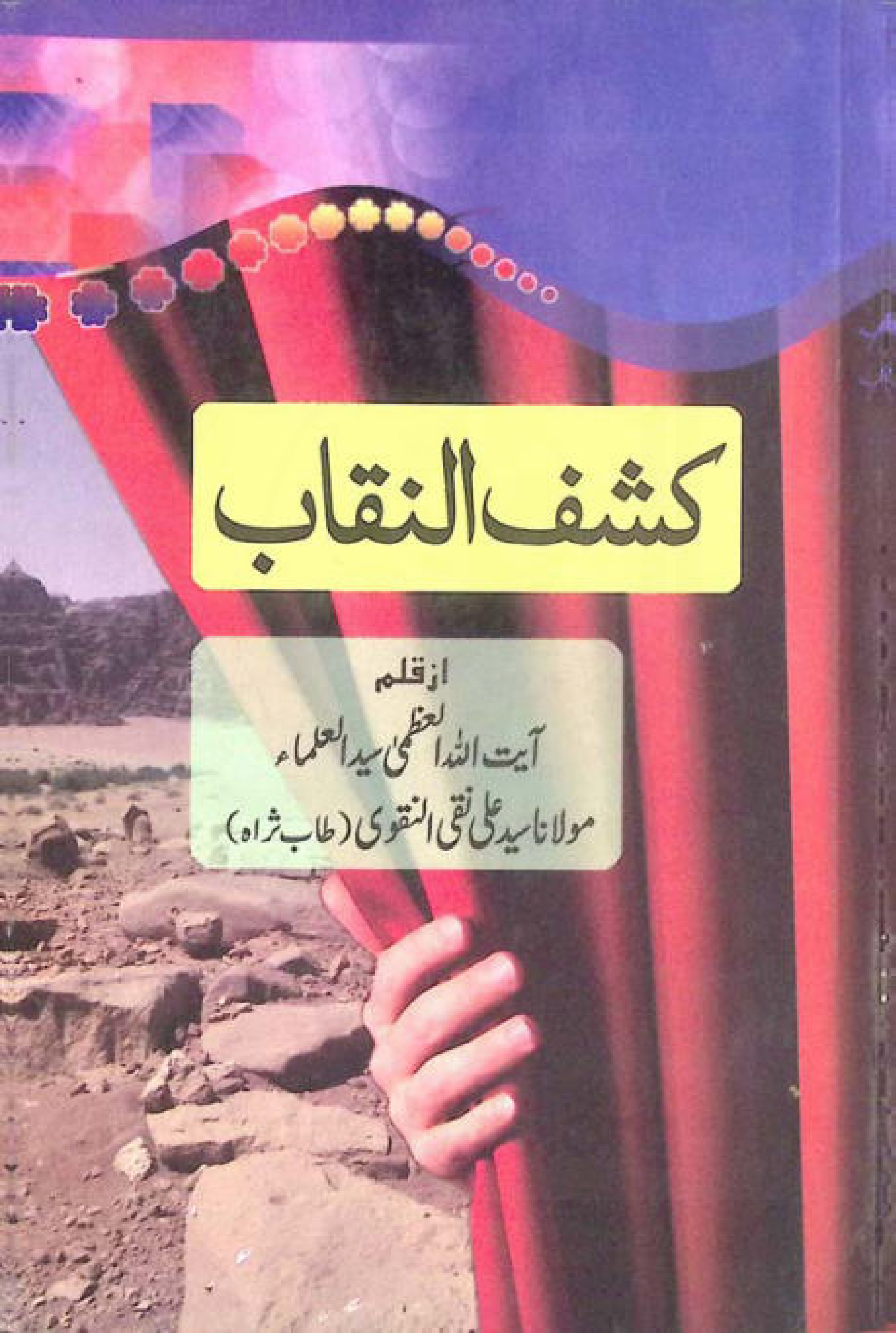


کشف النقاب

از قلم

آیت اللہ العظمیٰ سید العلماء
مولانا سید علی نقی النقوی (طاب ثراہ)

سال اشاعت: جنوری 2015

خلاصہ و اظہار تشکر

زیرِ نظر کتاب ''ردِّ وھابیہ'' دراصل عربی کتاب ''کشف النقاب'' کا اردو ایڈیشن ہے۔

اور کشف النقاب وہ نادرو نایاب کتاب ہے جو سرکار سید العلماء مدظلہ العالی نے اپنی زمانہ طالب علمی میں رواق سید الشہداء اور روضۂ نجف اشرف میں قیام فرما کر تحریر فرمائی تھی۔ کتاب کتنی مُستند و جامع ہے اس کا فیصلہ خود اہلِ نظر فرمائیں گے۔

اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

اس نایاب زمانہ کتاب کا ایک نسخہ بمبئی میں آقائی رجبی مدظلہ (پیش نماز مسجد ایرانیان المعروف بہ مغل مسجد) کے پاس موجود تھا جو موصوف نے میرے کہنے پر جناب محمد صادق کے ذریعے اس خواہش کے ساتھ مجھے مرحمت فرمایا کہ اس کی اشاعت اردو کے علاوہ عربی زبان میں دوبارہ ہو۔

اور جب میری خواہش اور ضد کے پیشِ نظر سرکار سید العلماء مدظلہ نے ازراو لطف و خورد نوازی اپنی عدیم الفرصتی، پیرانہ سالی اور ناسازی مزاج کے باوجود عربی مسودے پر نظرِ ثانی فرما کر اور اردو کتاب کو از سرِ نو ترتیب دے کر اور تہران میں مکمل فرما

کے مجھے عنایت فرمایا تو میں نے عربی متن کی ایک زیروکس کاپی آقای رجبی کے پاس بھیجی تاکہ وہ آقای الحاج سید محمد موسوی (وکیل آیۃ اللہ الخوئی مدظلہ العالی مقیم بمبئی) سے اپنے خاص التماس روا سم کی بنا، پر اس کی اشاعت کے لئے مدد لیں۔ لیکن آقای موسوی نے بر بنائے مصلحت، یا بر بنائے مجبوری یا بر بنائے "ناقابل اشاعت" اس کو در خور اعتناء نہ سمجھا، حالانکہ "کشف النقاب" وہ کتاب ہے جس کے دلائل و براہین کا مطالعہ فرما کر خود اعلم دوران آیۃ اللہ الخوئی مدظلہ العالی نے اس کے پہلے ایڈیشن پر تقریظ تحریر فرمائی ہے۔ بہر حال یہ عکس موسوی صاحب کے پاس اب تک موجود ہے۔

گو کہ میں نے ان کتابوں کی طاعت واشاعت کا بیڑہ تن تنہا اُٹھایا تھا لیکن بعد میں سرکار سید العلماء مدظلہ کے بعض پرستاروں اور محبین نے بھی اس کار خیر میں شرکت کا اظہار فرمایا تو میں انکار نہ کر سکا۔

چنانچہ میرے شکریے کے مستحق ہیں:

الحاج قاضی سید محمد احمد صاحب جنہوں نے سہم امام علیہ السلام میں سے پانچ ہزار روپے کی خطیر رقم مرحمت فرمائی۔

جناب سلامت رضوی جنہوں نے اردو کتاب کی کتابت فرمائی اور ایک پیسہ بھی بطور اجرت نہیں لیا۔

جناب میر احمد علی رضوی اور جناب سرفراز حسین چھبّر کا جنہوں نے کتاب کی تدوین وطباعت کی ذمہ داری اپنے سر لی۔

جناب ایم غلام حسین اور جناب غلام حسین زیدی کا جنہوں نے اردو کتاب کی تصحیح میں تعاون کیا۔ اور جناب مولانا سید حسن صاحب قبلہ مدظلہ کا جنہوں نے ان ہر دو حضرات کی تصحیح کے سلسلے میں مدد فرمائی۔

اب رہا سوال حضرت سید العلماء مد ظلہ العالی کے شکریہ کا، تو میرے نزدیک یہ جسارت بیجا اور ایک قسم کی خود نمائی ہے۔

یہ بات دوپہر کے سورج کی طرح روشن ہے کہ مذہب حقہ اثنا عشریہ پر جو حملے کم از کم اس صدی کے دوران ہوئے ہیں ان کا سکرت اور دندان شکن دفاع اکثر سید العلماء ہی فرماتے رہے ہیں، اس کے لئے میں تو کیا ساری شیعہ قوم سرکار عالی کے زیر بار احسان رہے گی۔ اور جب جب اس قسم کے حملے دنیائے شیعیت پر کئے جائیں گے، آنجناب ہی کے تحقیقات و نگارشات کے ہتھیاروں سے ان کا مقابلہ ہوتا رہے گا۔ اور ان کی کاٹ کی جاتی رہے گی۔

میری دعا ہے کہ خداوند عالم بطفیل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آل محمد علیہم السلام ان کو تندرست و توانا رکھے اور ان کا سایہ ہمارے سروں پر باقی رکھے۔

فقیر در اہل بیت علیہم السلام

جعفر علی اصیل

مقدمہ ناشر

ردِ وہابیہ کے سلسلے میں سرکار سید العلماء کی یہ معرکۃ الآراء کتاب جیسا کہ اس کے اصل کتاب کے اصل دیباچے سے ظاہر ہوگا نجف اشرف (عراق) میں لکھی گئی تھی اور وہیں آج سے نصف صدی سے زیادہ پہلے طبع ہوئی تھی۔ اس لئے ظرف مکان اور ظرف زمان دونوں کی دوری کی وجہ سے اب وہ مثل قلمی کتابوں کے جو غیر مطبوعہ ہوں، کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہوگئی تھی۔ اس لئے ہم نے سرکار مصنف دام ظلہ سے استدعا کی کہ وہ اس پر دوبارہ نظر ثانی فرما کر اشاعت کے لئے مرحمت فرمادیں اور چونکہ اصل کتاب عربی زبان میں ہے جس سے ہندوستان اور پاکستان کے افراد عمومی طور پر استفادہ نہیں کر سکتے، اس لئے وہ انہیں مناسب اضافوں کے ساتھ اردو میں بھی تحریر فرمادیں۔ چنانچہ ہماری خوش نصیبی ہے ہمارے یہ دونوں معروضے پایہ قبول تک پہنچے اور اب علاوہ عربی کتاب کی دوبارہ اشاعت کے یہ اردو کتاب بھی ہم منظر عام پر لانے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

والسلام

پیش لفظ از مُصنّف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ علی سید المرسلین

والہ الطاھرین۔

نصف کتاب کا پس منظر:۔

میرا لکھنؤ میں واقعی بچپن تو نہیں، آغاز جوانی کا دور تھا جس میں آدمی کو ہمارے ہندوستان کے عرف عام میں ''بچہ'' ہی کہا جاتا ہے، جب حجاز میں سعودی سلطنت قائم ہوئی اور وہابی تصورات پوری شدت کے ساتھ منظر عام پر آئے اور ان کے عملی مظاہرات یوں ہوئے کہ پہلے جنت المعلیٰ (مکہ معظمہ) کے محترم مزارات منہدم کیے گئے اور پھر قاضی القضاۃ شیخ ابن بلیہد نے ایک نمائشی استفتا کے ساتھ بظاہر علمائے مدینہ کے فتوے سے جنت البقیع کے مزاراتِ مقدسہ مسمار کرائے۔ جس سے عالم اسلام کے ایک بڑے حصے میں اور دنیائے تشیع میں کلیتہً تلاطم ہو گیا۔ اس لئے کہ یہاں شیعوں کے چار امام حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت امام زین العابدین علیہ السلام، حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے روضے بھی تھے۔ اور ان کے علاوہ حضرت سیدۂ نسائے عالمین فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے قبر مطہر بھی تھی۔ اور دوسرے قبور بھی ایسی تھیں جن سے دوسرے مسلمانوں کی وابستگی ہو۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے وقت سے ایک جماعت نجدی عقائد کی پرستار رہی تھی مگر یہ جماعت مسلمانوں میں گھلی ملی ہوئی تھی۔ اب حجاز کے انقلاب کے بعد اس نے کھل کر ابن سعود کی حمایت شروع کر دی۔ ظفر علی خاں کا مشہور اخبار زمیندار (لاہور) اس جماعت کا خاص

آرگن تھا۔ مشائخ، صوفیا اور لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل شیعوں کے ساتھ مل کر اس جماعت کے مقابلے میں صف آراء ہوئے۔ چنانچہ فرنگی محل میں انجمن "خدام الحرمین" قائم ہوئی جس کے سرپرست اس وقت کے سربرآوردہ فرنگی محل کے عالم مولانا قیام الدین محمد عبدالباری صاحب تھے اور آل انڈیا شیعہ کانفرنس لکھنؤ کے زیر سایہ انجمن "تحفظ مآثر متبرکہ" قائم ہوئی۔

بلا تفرقہ شیعہ وسنی رفاہ عام لکھنؤ میں جلسۂ عام ہوا اور پھر قیصر باغ میں حجاز کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں علاوہ علمائے شیعہ اور علمائے فرنگی محل کے تمام ہندوستان کے اکابر، علماء ومشائخ اور کچھ اہم لیڈر مسلمانوں کے شریک ہوئے۔ ان میں جن شخصیتوں کے نام اور صورتیں مجھے یاد ہیں وہ مولانا عبدالماجد بدایونی، شاہ فاخر الہ آبادی، اور مولانا مظہر الدین ایڈیٹر الامان اور سب سے پیش پیش مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی تھے۔

مسلمان مشہور لیڈروں میں علی برادران شروع میں ابن سعود کے حامی تھے اور اکثر واقعات کو جھٹلاتے رہتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے خود جا کر حجاز کے حالات دیکھے تو ان کے رویے میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ اور حجاز کانفرنس میں وہ بھی شریک ہوئے۔

اس جلسے میں علمائے شیعہ میں سے جناب نجم الملتہ اور جناب ناصر الملتہ اور دیگر علماء کے ساتھ علمائے اہل سنت میں سے مولانا عبدالباری صاحب وغیرہ کے اتفاق رائے سے التوائے حج کی تحریک پیش ہوئی اور حضرات علماء کے علاوہ فخر قوم مولوی سید کلب عباس صاحب نے اس کی تائید میں گھن گرج تقریر کی۔ اور جہاں تک یاد ہے مظہر الدین صاحب ایڈیٹر الامان نے بھی تائید کی۔ مگر علی برادران مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر نے اس تجویز کی مخالفت کی اور مولانا محمد علی نے اپنے سیاسی سوجھ بوجھ ظاہر کرتے ہوئے، یہ مصرع پڑھا:۔

"عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں"

ان کی تقریر ختم ہوتے ہی شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی کھڑے ہوئے اور انہوں نے

ان کی رد کرتے ہوئے کہا کہ صرف سیاسی سوجھ بوجھ کوئی چیز نہیں اس کے ساتھ دینی بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔ میں اس مصرع کو اکیلا نہیں پڑھوں گا۔ مجھے حق ہے کہ میں اس کا دوسرا مصرع پڑھوں:

''پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں''

چنانچہ تجویز کثرت رائے سے منظور ہوئی۔

چونکہ دیگر علماء کے ساتھ اس جہاد میں ہمارے والد بزرگوار اور جناب ممتاز العلماء سید ابوالحسن عرف منن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہٗ بڑے جوش وخروش کے ساتھ شریک تھے، اس لئے میں جس کے عنفوان شباب کے ساتھ جولانی قلم کا ابتدائی دور تھا اپنے قلم کو لئے اس میدان میں اُتر پڑا جس میں پہلی مرتبہ بلاتفریق شیعہ وسنی عالم اسلام سے متعارف ہوا۔ اس ذیل میں چونکہ سب سے اہم مسئلہ ''عمارتِ قبور'' کا تھا اس لئے اخبار ''زمیندار'' کے ایک مضمون کی رد میں ''البیت المعمور فی عمارۃ القبور'' کتاب لکھی جو اس وقت کے ممتاز شیعی مطبع ''نور المطابع'' میں شائع ہوئی۔ اور بکثرت اسلامی جرائد میں اس پر تبصرے شائع ہوئے اور دور دور سے اس کی مانگ آئی اور یہ کتاب بہت کم عرصے کے اندر اطراف ملک میں منتشر ہو گئی۔ پھر اخباروں میں بکثرت مضامین کے علاوہ التوائے حج کے مسئلے پر شیعہ اور سنی دونوں کے نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے ایک بسیط مضمون لکھا جسے ادارہ ''خدام الحرمین'' نے کچھ دوسرے حضرات کے مضامین کے ساتھ شائع کیا۔ جناب نجم الملت اعلی اللہ مقامہٗ کے پاس عراق وشام وغیرہ کے علماء کے جو منشور اس موضوع پر آئے تھے، اُن کے حکم سے اُن کا اردو ترجمہ اور اپنی طرف سے عالم اسلام کے نام ایک عربی اپیل ترجمے کے ساتھ شامل کر کے ''فریاد مسلمانانِ عالم'' کے نام سے ایک کالم میں عربی اور دوسرے پہلو کے کالم میں اُردو، اس طرح ایک مجموعہ مرتب کیا جسے انجمن ''موید العلوم'' مدرسۃ الواعظین لکھنؤ نے شائع کیا۔

(اصل عربی کتاب کی تصنیف اور اس کی کیفیت)

اب میں نے اس موضوع پر عربی میں ایک مکمل کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جس میں وہابیت کی تاریخ اور نجدیوں کے تمام عقائد پر سیر حاصل تبصرہ ہو۔ اس کے لئے ماخذوں کے تلاش میں مختلف کتب خانوں کی سیر کرنا پڑی۔ اور کافی مواد مکمل حوالوں کے ساتھ فراہم ہو گیا۔ لیکن ابھی اس کی ترتیب کے ساتھ جمع آوری اور کتاب کی تحریر کا کام شروع نہیں ہوا تھا کہ شعبان ۱۳۴۵ھ میں تکمیل علم کے لئے میرا عراق کا سفر ہو گیا۔ اتفاق سے اسی دن سید الفقہاء، جناب مولانا مفتی سید احمد علی صاحب قبلہ مع متعلقین زیارت عتبات عالیات کے لئے روانہ ہوئے اور ریل اور جہاز دونوں میں ان کا ساتھ رہا۔ کربلائے معلیٰ میں حرم حسینی کے قریب ایک مکان تاج محل مرحومہ کا تھا، جس میں اکثر ہندوستانی زائرین ٹھہرتے تھے۔ یہاں قیام ہوا۔

فطری طور پر جو شخص زیارت کے لئے جاتا ہے، وہ اگرچہ نجف اشرف، کاظمین، سامرا تمام مشاہد مشرفہ کی زیارت کو جائے گا مگر روانگی کے وقت جب پوچھا جائے کہاں جا رہے ہو؟ تو کہے گا "کربلائے معلیٰ" اور جو شخص تحصیل علم کے لئے جا رہا ہو، وہ بھی اگرچہ ان تمام مشاہد مشرفہ کی زیارت کرے گا جب اس سے پوچھا جائے کہا جا رہے ہو؟ تو کہے گا "نجف اشرف"۔ چنانچہ جناب مفتی صاحب قبلہ چونکہ زیارات کے لئے گئے تھے تو کربلا پہنچ کر ان کا احساس یہ تھا کہ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ لہٰذا کچھ مدت کے لئے وہاں رہ گئے اور میں دو چار دن وہاں مشرف رہ کر نجف اشرف چلا گیا۔ اور چند دن خادم کے یہاں قیام کر کے مدرسۂ ہندی میں جو لاہور کے خاندان قزلباش کا بنوایا ہوا تھا، اس لئے "مدرسۂ نواب" کہلاتا تھا، مقیم ہو گیا۔ عراق و ایران میں مدرسے کے معنی ہوتے ہیں بورڈنگ ہاؤس یعنی طلبہ کے لئے دارالاقامہ۔ ورنہ درس تو مسجدوں میں یا علماء کے مکانات پر ہوتے ہیں۔

اب پہنچ تو گئے مگر تدریس کا کام ابھی شروع نہ ہو سکتا تھا کیونکہ ماہ رمضان کے قرب کی

وجہ سے درس بند ہو چکے تھے۔ اور ۹، شوال تک تعطیل تھی۔ لہٰذا ہم نے اس درمیانی مدت کو بامصرف بنانے کے لئے یہ کام ہاتھ میں لیا کہ ردّ وہابیہ کا وہ مواد جو ہندوستان میں جمع کیا تھا، اُسے کتابی شکل میں عربی میں لکھنا شروع کر دیا۔ اس التزام کے ساتھ کہ دس (۱۰) صفحے روز مسودے کے لکھے جائیں گے۔ چنانچہ دس (۱۰) دن میں سو (۱۰۰) صفحات کی کتاب کا مسودہ تیار ہوا اور اسی التزام کے ساتھ دس (۱۰) دن میں اُسے صاف کیا۔

نجف اشرف میں ایک جلیل القدر صاحب علم و اطلاع، علاوہ علوم دینیہ کے عربی کے بلند پایہ ادیب و شاعر اور غیرت دینی و احساس اسلامی رکھنے والے، علامہ میرزا محمد علی اردوبادی تھے اور وہ بغیر ذرہ بھر ملکی و قومی تعصب کے خالص علمی اور دینی اقدار کے زبردست قدر دان تھے۔ انہیں نہ معلوم کیونکر میرا حال معلوم ہو گیا اور وہ پوچھتے ہوئے اسی ابتدائی دور میں مدرسے کے حجرے میں میرے پاس پہنچ گئے۔ اور ایک دم انہیں مجھ سے ایسی محبت پیدا ہوئی جس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور بعد میں ہماری اس "یک جان و دو قالب" والے اتحاد میں علامہ سید محمد صادق بحر العلوم شریک ہو گئے تو ہم (بلا تشبیہ) "اقالیم ثلثہ" ایسے ہو گئے کہ میرے پورے زمانہ قیام نجف میں ہمارا اتحاد مثالی حیثیت اختیار کر گیا۔ بعد میں جب ہم لوگ جسمانی طور پر متفرق ہو گئے، تب بھی قلبی ارتباط ہم لوگوں کا غائبانہ طور پر برقرار رہا۔

بہر حال پہلی ملاقات کے بعد تقریباً ہر روز علامہ اردوبادی آنے لگے اور جتنا جتنا یہ کام ہوتا گیا، وہ اس پر مطلع ہوتے رہے اور انہوں نے نجف اشرف کے علمی حلقے میں اُس کا چرچا شروع کر دیا۔ اس طرح تصنیف مکمل ہونے سے پہلے ایک معنی میں نجف اشرف میں اس کتاب کی اشاعت ہو گئی۔ اور اب ہم شب قدر کی مخصوص میں زیارت کربلائے معلی کے لئے گئے تو یہ کتاب صاف شدہ شکل میں ساتھ موجود تھی۔

چونکہ جناب مفتی صاحب مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے، اس لئے میں اس دفعہ بھی

انہی کے پاس تاج محل میں جاکر ٹھہرا اور ان کے پاس قدیمی تعلقات کے بناء پر کربلائے معلی کے علماء وافاضل تشریف لایا کرتے تھے۔ اب میں موجود تھا تو ہر محفل میں حاضر رہتا تھا اور جناب مفتی صاحب تعارف میں میری اس تصنیف کا ذکر فرماتے تھے۔

چونکہ وہابی مظالم اور وہابی نظریات کا چرچا ہر جگہ شدت کے ساتھ تھا، اس لئے متعدد حضرات ردِ وہابیہ میں کتابیں لکھ رہے تھے اور میرے سن وسال کو دیکھ کر اس کتاب کا ذکر سنتے ہوئے متعجبانہ طور پر اس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرماتے تھے۔ اب میں ہر ایک کو یہ تحریر دیکھنے کے لئے کہاں دیتا۔ پڑھ کر سنانے لگتا تھا جس سے انہیں مزید مندرجات کتاب کے سننے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ یوں چند دن مغربین کے بعد کافی رات تک میرا ایک مستقل مشغلہ کتاب خوانی کا ہو گیا۔ اور روز ان حضرات کے ساتھ کچھ نئے افراد جن تک یہ تذکرہ پہنچتا تھا، مشتاق ہو کر تشریف لاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے لحاظ سے میں اس وقت ابتدائی درجے کا طالب علم تھا اور یہ حضرات وہاں کے طلبہ نہیں بلکہ علماء کی حیثیت رکھتے تھے مگر ان کی وسعت قلبی تھی کہ ہر ایک نے اس موضوع پر اس کتاب کو ایک نادر چیز سمجھا۔ یہاں تک کہ آقا شیخ محمد علی قمی جو اس وقت اکابر علماء کربلائے معلی میں تھے، ساٹھ سال سے بظاہر عمر متجاوز تھی اور کفایہ پر ان کا حاشیہ دو جلدوں میں نجف اشرف میں طبع ہوا بعد میں جب عراق ہی میں تھا تو وہ ایران تشریف لے گئے تو آیۃ اللہ العظمیٰ حاج شیخ عبدالکریم یزدی حائری کے بعد قم میں صف اوّل کے علماء میں ان کا شمار ہوا۔ وہ بھی چونکہ ردِ وہابیہ میں ایک رسالہ تحریر فرما رہے تھے تو اس کتاب کا ذکر سن کر وہ تشریف لائے۔ اور خواہش فرمائی کہ وہ دو تین دن کے لئے اسے ساتھ لے جائیں۔ میں نے ان کی جلالت اور بزرگی سے متاثر ہو کر اس کتاب کا انہیں دے دینا گوارا کر لیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے اور حسب وعدہ تین دن بعد تشریف لاکر اُسے واپس کر دیا چنانچہ اس کے بعد ممدوح کا رسالہ اس موضوع پر شائع ہوا اور دوسری کتاب علامہ شیخ محمد علی سنقری کی جس کا نام تھا "المشاھد المشرفه

والوھابیون" تیسری کتاب حجۃ الاسلام آقا سید حسن قزوینی کی نکلی۔

ہمارے مورث اعلیٰ حضرت غفران مآب طاب ثراہ کے استاد صاحب ریاض کی اولاد میں آقا سید محمد علی طباطبائی ایک بڑے غیرت دینی رکھنے والے حساس بزرگ تھے جو سرکار آقا میرزا محمد تقی شیرازی اور آقائے شریعت وغیرہ کی سرکردگی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کے تسلط سے عراق کو آزاد رکھنے کے جہاد میں شریک رہ چکے تھے، انہیں میری کتاب سے انتہائی گرویدگی پیدا ہوگئی اور میں چند روز کے بعد نجف اشرف واپس ہوا تو علامہ اردوبادی نے اپنے حلقۂ احباب میں نجف اشرف کے اندر اور آقا سید محمد علی طباطبائی نے کربلائے معلیٰ میں یہ تحریک چلائی کہ اس کتاب کو چھپنا چاہیے۔ چنانچہ مطبع حیدریہ نجف اشرف میں یہ کتاب طبع ہوئی۔

اس زمانے میں خود میری ذہنیت روادارنہ تھی۔ اس لئے کتاب کا نام رکھا تھا:

"سوط عذاب علی اتباع ابن عبدالوھاب"

جو مجھے بہت پسند تھا مگر طباعت کے وقت ان حضرات نے کہا کہ یہ نام سخت ہے اور بدلوا کر "کشف النقاب عن عقائد ابن عبدالوھاب" نام رکھنے پر مجبور کیا جس کا اس وقت بہت دکھ ہوا۔ پھر آخر کتاب میں ایک اختتامی تبصرہ تھا، وہ ان لوگوں نے نکلوا دیا کہ اس کا لب ولہجہ بہت سخت ہے۔ اس ملک کی فضا اس کی متحمل نہیں ہے۔ مجبوراً وہ بھی نکال دیا اور صرف چند سطروں کا اضافہ کر کے ختم کر دیا جس کا مزید صدمہ ہوا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ میری ذہنیت خود روادارانہ ہوگئی جس کی ہندوستان میں سزا بہت بھگتنا پڑی۔

اس کتاب کے مسودے کے ابتدائی صفحے پر میرے اس وقت کے ابتدائی استاد، عصر حاضر کے مرجع تقلید آیۃ اللہ الحاج سید ابوالقاسم خوئی دام ظلہ نے جو، اس وقت درس سطحی کے مدرس تھے چند سطریں بھی بطور تقریظ لکھی تھیں۔ پھر چھپنے کے بعد کتاب اطراف واکناف میں منتشر ہوگئی

تو ہندوستان کے بزرگ مرتبہ عالم مولانا سید ظہور حسین صاحب قبلہ نے ایک عربی تقریظ لکھ کر بھیجی اور اہل سنت کے بزرگ عالم اور شیخ طریقت مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواری نے نظم اور نثر عربی میں تقریظیں بھیجیں اور زبانی ایسے الفاظ فرمائے جو والد علام ممتاز العلماء طاب ثراہ نے اپنے اجازہ میں جو میرے لئے چند سال کے بعد لکھا تھا درج فرمائے۔

شام کے بزرگ مرتبہ عالم جناب سید محسن امین عاملی طاب ثراہ نے جو مشہور بڑی کتاب "اعیان الشیعہ" کے مصنف تھے دو سال بعد ایک ضخیم کتاب اس موضوع پر "کشف الارتیاب" تحریر فرمائی تو میری اس کتاب کے دو صفحے اس طرح اخذ فرمائے جس میں تعبیری طور پر ایک بڑے مسامحے کی صورت میں پیدا ہو گئی اور وہ یہ کہ میں نے "تاریخ نجد" ابن الآلوسی سے وہابی تحریک کے ابتدائی نشوونما کے حالات لکھے ہیں تو فٹ نوٹ میں لکھ دیا ہے کہ نقلناها بمعناها من تضاعيف تاريخ نجد لابن الالوسی، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عبارت تاریخ نجد میں کسی جگہ نہیں ہے۔ موصوف نے اس نوٹ اور اس کے مفہوم پر توجہ نہیں فرمائی، اور اس عبارت کو تاریخ نجد ابن الآلوسی کے حوالے سے درج فرما دیا۔ حالانکہ وہ عبارت میری ہے، ابن الآلوسی کی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی تلاش کرے تو تاریخ نجد میں کسی جگہ بھی وہ عبارت نہیں مل سکتی۔ جب یہ کتاب میری نظر سے گزری تو میں نے ایک خط کے ذریعے ممدوح کو اس مسامحے کی طرف توجہ دلائی۔ ممکن ہے نظر ثانی میں موصوف اس کی اصلاح فرما دیتے مگر جہاں تک مجھے علم ہے، وہ کتاب دوبارہ طبع نہیں ہوئی۔

....

(دوبارہ اشاعت اور اردو ترجمے کا پس منظر)

میری کتاب "کشف النقاب" چونکہ علامہ اردو بادی کے اہتمام سے چھپی تھی تو اس کا مرکز طباعت کے بعد ان کا مکان رہا۔ وہیں سے فروخت ہوئی اور جو حضرات علماء ایران

وغیرہ سے آتے تھے، انہیں تحفۃً بھی وہی دیتے تھے۔ ہندوستان میں صرف چند کا پیاں آئی تھیں جو میں نے کچھ علمائے اعلام کو تحفۃً بھیجی تھیں۔ میرے پاس صرف ایک کاپی تھی جو لکھنؤ کے فرقہ ورانہ فساد کے ذیل میں جو چند سال قبل چہلم (۲۰ صفر) کے دن ہوا تھا، میرے مکان اور کتب خانے کی آتشزدگی میں نیست و نابود ہو گئی۔

اب حبیب محترم جناب جعفر علی اصیل صاحب (بمبئی) نے جو اس کی دوبارہ طباعت کا خیال ظاہر کیا اور اُردو میں بھی اس کی اشاعت کے لئے کہا تو میرے لئے اس کی تعمیل ممکن نہ تھی مگر موصوف نے خود بمبئی میں تلاش کر کے ایک کاپی دستیاب کی اور اس کا عکس میرے پاس بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد مجھ پر حجت تمام ہو گئی جس کے بعد اگر میں پہلو تہی کروں تو اس امر خیر کے انجام پانے میں میری تقصیر سدّ راہ قرار پائے۔ لہٰذا باوجود شدید موانع اور مصروفیتوں کے کافی تاخیر کے ساتھ سہی، میں اس مقصد کے لئے "قلم بانگشت" ہو گیا اور اب اتنے عرصے میں خود ہندوستان میں اس موضوع پر جو مزید مواد فراہم شدہ میرے پاس موجود تھا، اس میں کچھ جو عربی کے لئے موزوں تھا اس کا اصل عربی کتاب میں بھی اضافہ کر دیا اور جو ہندوستان ہی کے لئے موزوں ہے، اُسے اس اُردو کتاب میں شامل کر رہا ہوں، کیونکہ اُن شخصیتوں سے جن کے تراوشات قلمی سے کام لیا گیا ہے، ہندوستان ہی کے اسلامی حلقے ہی متعارف ہیں۔ نیز جو مقدمہ لکھا جا رہا ہے، اس کے بھی کچھ مضامین مسلمانانِ ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا اُن کو بھی عربی میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس طرح میرا اندازہ یہ ہے کہ اُردو کتاب کا حجم عربی والی کتاب سے کچھ زیادہ ہوگا۔ اس لئے مجموعی طور اُسے عربی کتاب "کشف النقاب" کا ترجمہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کے پورے ترجمے پر مشتمل اُردو میں اسے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت حاصل ہے۔

والسلام

علی نقی النقوی

۱۰، ذیقعد ۱۴۰۴ھ (علیگڑھ)

خلاصہ دیباچہ عربی کشف النقاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد حمد خالق متعال وصلوٰۃ وسلام بر محمد وآل محمد:۔

یہ کتاب "کشف النقاب عن عقائد ابن عبد الوہاب" علی نقی النقوی کے قلم سے معرض وجود میں آرہی ہے۔ اس وقت جب توفیق الٰہی نے سرزمین نجف اشرف پر پہنچنے کی سعادت عطا فرمائی ہے اور بس سامان سفر منزل قیام پر اتارنے کے بعد جو عرصے سے میرے ذہن میں خیال تھا کہ ایک کتاب ایسی تحریر ہو جس میں وہابی جماعت کے عقائد کا ذرا تفصیل کے ساتھ بیان ہو، اس لئے کہ بہت سے افراد اس فرقے کے عقائد سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں۔ چنانچہ بہت کم دنوں میں اس کی تکمیل ہوگئی۔ اور اس کتاب کو میں نے ایک مقدمے اور چند ابواب پر تقسیم کیا ہے:۔

مقدمہ: تاریخ ابن عبد الوہاب اور ان کی نشوونما اور ترقی کی کیفیت۔

پہلا باب: اُن کا عقیدہ حضرت اقدس الٰہی کے باب میں۔

دوسرا باب: اُن کا عقیدہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں۔

تیسرا باب: اُن کا عقیدہ اولیاء و صالحین کے بارے میں۔

چوتھا باب: اُن کا عقیدہ تمام روئے زمین کے مسلمانوں کے بارے میں۔

پانچواں باب: اُن کا عقیدہ انبیاء و صالحین کے مزارات اور قبروں کے بارے میں۔

چھٹا باب: اُن احادیث و اخبار میں جو اہل نجد کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہوئے۔

ساتواں باب: وہابی جماعت کی عملی سرگرمیاں اس کے نمایاں ہونے کے وقت سے زمانہ حال تک۔

نوٹ:

اس اردو کتاب میں مذکورہ عناوین سے پہلے دو عنوانوں کا جنھیں اس اردو کتاب کا مقدمہ سمجھنا چاہیے، شروع میں اضافہ کیا جارہا ہے:-

(۱) مسلمانوں میں عموماً اور شیعوں میں خصوصاً ہندوستان و پاکستان کے اندر لفظ وہابی کی اصطلاح۔

(۲) ہندوستان میں وہابیت کا فروغ اور اس کی مختلف شکلیں۔

مسلمانوں میں عموماً اور شیعوں میں خصوصاً

ہمارے یہاں کی اصطلاح

اصل ''وہابی'' تو ابن عبدالوہاب کا پیرو، وہی حجاز کا برسر اقتدار گروہ ہے جو نجد کا باشندہ ہے اور اس لئے ان کا پایہ تخت اب بھی نجد کے علاقے میں شہر ریاض ہے۔ یہ فقہ کے لحاظ سے حنبلی ہیں یعنی امام احمد حنبل کی فقہ کے پیرو ہیں اور اصول عقائد میں ان کے پیش رو ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم اور ابن عبدالہادی وغیرہ ہیں۔

انہی ابن تیمیہ وغیرہ کے تصورات کو محمد بن عبدالوہاب نے اپنا کر چونکہ بارہویں صدی کے اواخر اور تیرھویں صدی کے آغاز میں علاقہ نجد کے ایک حصے کے اُس وقت کے سعودی خاندان کے راس و رئیس محمد بن سعود کی مدد سے پھیلایا جس کی تاریخ اس کتاب کے عربی مقدمے کے ترجمے میں بیان ہوگی۔ اس لئے اگرچہ اُن کے باپ عبدالوہاب اس مسلک سے ان کے ساتھ متحد نہ تھے بلکہ آخر میں باپ بیٹے کی مخالفت بہت نمایاں ہوگئی تھی مگر وہ مسلک بیٹے کے نام پر نہیں بلکہ بیچارے باپ کے نام پر جو اس کے خلاف تھے منسوب ہوکر ''وہابی'' کہلایا۔

پھر چونکہ ان کی تعلیم کا اہم جزو درگاہوں اور روضوں پر حاضری کی مخالفت اور اولیاء و مقربین بارگاہِ الٰہی اور بالخصوص رسول ﷺ و آلِ رسول ﷺ سے توسّل کو شرک قرار دینا اور نذر و نیاز اور فاتحے وغیرہ سے ممانعت تھی۔ لہٰذا ہندوستان اور پاکستان کے اندر اہل سنت میں یہ

اصطلاح ہوگئی کہ بریلوی حضرات جو ان باتوں کے قائل ہیں، وہ اپنے کو "سُنّی" کہتے ہیں اور دیوبندی حضرات کو جو اکثر ان چیزوں کے منکر ہیں "وہابی" کہتے ہیں۔ چنانچہ کچھ بریلوی مقررین اور بعض صاحب قلم بھی جب دیوبندی حضرات کا ذکر کرتے ہیں تو مثلاً یوں کہتے ہیں کہ مولوی نمبر ۲۴ نے یوں کہا۔ چونکہ "وہابی" کے عدد ۲۴ ہیں۔

ہندوستان کے شیعوں کا یہ محاورہ ہوگیا ہے کہ وہ اہل سنت کے اس طبقے کو جو ان باتوں کا قائل ہے اور اکثر شیعوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرتے ہیں یا عزاداری وغیرہ میں شریک ہوتے ہیں حنفی کہتے ہیں اور ان امور کے منکرین اور بالخصوص عزاداریٔ امام حسین علیہ السلام کے مخالف افراد کو وہابی کہتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دیوبندی حضرات مسلک فقہی کے لحاظ سے حنفی ہیں۔ وہابیوں کے ہم مسلک یعنی حنبلی نہیں ہیں اور شیعوں کے اصطلاح میں "وہابی" سنیوں کی جو سب سے بڑی مثال ہو سکتی ہے مثلاً مولوی عبدالشکور صاحب اپنے وقت کے مدیر النجم، وہ بھی مسلکاً حنفی تھے وہابیوں کی طرح حنبلی نہیں تھے۔

ہماری اس کتاب کا نام جو "ردِ وہابیہ" ہے، اس میں ہمارا نصب العین اُسی خاص گروہ کی رد ہے جو ابن عبدالوہاب کا پیرو ہے لیکن بحیثیت موضوع جبکہ توسل وغیرہ مباحث پر فیصلہ کن بحث کی جائے تو جو اُن لوگوں کے ان تصورات میں ہم مسلک ہوں، سب کی رد ہو جائے گی۔ چاہے وہ کسی بھی معنی میں "وہابی" قرار پاتے ہوں یا نہیں۔

ہندوستان میں وہابیت کی آمد اور اُس کا ارتقاء

جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ہندوستان میں وہابی تصورات کی درآمد جناب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ذریعے سے ہوئی۔ وہ چاہے خود کلیتہً ان عقائد کے علم بردار نہ ہوں جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ وہ خود تصوف کے قائل ہیں بلکہ اُن کا مشائخ صوفیاء میں شمار ہے اور ان کے صاحبزادگان جناب شاہ عبدالعزیز دہلوی مصنف تحفۂ اثناعشریہ وغیرہ اس باب میں نمایاں نہیں ہوئے مگر ان کے بعد شاہ اسماعیل جن کے نام کے ساتھ عموماً ''شہید'' کی لفظ استعمال ہوتی ہے، اس مسلک کے بڑے علمبردار بن گیا ور اس جماعت کے سرگروہ سیّد احمد ہوئے کہ اُن کے نام کا بھی تقریباً جزء لفظ ''شہید'' ہے۔

علمائے دیوبند اگرچہ جیسا کہ پہلے آچکا حنفی ہیں اور غالباً تصوف کے بھی قائل ہیں اور اس کے سلسلوں میں منسلک ہیں اگر ان کی علمی حیثیت سے مورثِ اعلیٰ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے یہاں اس قسم کے تصورات اتنی شدت کے ساتھ ہیں کہ اُن کے الفاظ سے شان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں گستاخی کے پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ لوگ بالکل وہابی ہوں یا نہیں، مگر ان سے وہابیت کو تقویت ضروری ہوئی۔

بعض افراد جن میں مولانا ابوالکلام آزاد پیش پیش ہیں جو یقیناً وہابی مسلک کے پیرو نہیں تھے اور نہ تنگ نظری و عصبیت کا شکار تھے، یہاں تک کہ امتیازی نظریہ ''تبرا'' کی حمایت میں ''تولا و تبرا'' ہی کی سرخی سے وہ ایک ایسے مضمون کے خالق ہیں جسے امامیہ مشن لکھنؤ نے کتاب

''خلافت وامامت'' کے کسی حصّے کا جزو بنا کر شائع کیا تھا۔ اس مضمون میں خصوصیت کے ا ان مضامین کو ابن آلوسی بغدادی کی کتاب ''تاریخ نجد'' کے مختلف مقامات سے اخذ کر کے ہم نے اپنی عبارت میں درج کیا ہے۔

ساتھ چند الفاظ تو اتنے معنی خیز اور دل آویز ہیں کہ حفظ کرنے کے قابل ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ:

''اگر ہم یہ اصول بنالیں کہ بروں کو بھی اچھا کہیں گے تو جو
واقعی اچھے ہیں اُن کے لئے ہمارے پاس کیا رہ جائے گا؟''۔

مگر علمی طور پر وہ شیخ ابن تیمیہ کے ایسے مداح ہیں کہ جیسے وہ اُن کی جلالت علمی سے انتہائی مرعوب و متاثر ہیں۔ اُن کے بعد سے جیسے سوادِ اعظم کے صاحب قلم افراد کی وضع بن گئی ہے کہ وہ ابن تیمیہ کی تعریف ضرور کریں جو بظاہر تقلیدی حیثیت رکھتی ہے یعنی ان لوگوں نے جناب ابن تیمیہ کے تصانیف کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ بہر حال اس سے بھی بالواسطہ وہابی خیالات کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور اب سعودی حکومت اگرچہ بین الاقوامی دباؤ سے مذہبی طور پر بہت حد تک ''تقیہ'' میں ہے اور یہ ''تقیہ'' شروع ہی سے ''قبہ نبوی'' کی بقاء میں تو رہا ہی ہے جو کہ اُن کے نقطہ نظر سے (معاذ اللہ) ''صنم اکبر'' ہونے کی وجہ سے زیادہ مستحق انہدام تھا، اس کے علاوہ وہ مسلمانانِ عالم، یہاں تک کہ ہم شیعوں کو حج سے نہیں روکتے بلکہ بہت حد تک سہولتیں فراہم کرتے ہیں جبکہ اُن کے مذہب کی رُو سے ان سب کا ''مشرکین'' میں داخل ہونے کی بناء پر مسجدِ حرام کے قریب جانا ناجائز ہے مگر ان باتوں میں بظاہر ''تشدد'' کے کم ہونے کے باوجود، اب ان کی دولت جو تیل کی بدولت انتہائی افراط سے حاصل ہوگئی ہے، ممالک اسلامیہ میں وہابیت کی تبلیغ پر شدت کے ساتھ صرف ہو رہی ہے جس سے ذہنی طور پر شیعوں کو تو بس اذیت ہو سکتی ہے مگر ان کا اثر معتقدات کے لحاظ سے اہل سنت کی اکثریت پر پڑنا ناگزیر ہے۔

مقدمہ

ابن عبدالوہاب کی تاریخ زندگی اور نشوونما کی کیفیت[۱]

ابن عبدالوہاب کا نام ونسب محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان تمیمی ہے۔ اُن کی نشوونما علاقہ نجد کے شہر عیینہ میں ہوئی اور انہوں نے حنبلی فقہ اپنے والد سے پڑھی اور زمانہ صغر سنی ہی سے وہ ملت اسلامیہ کے عام رجحان کے خلاف باتیں کہنے لگے اور بہت سی باتوں پر جو مسلمانوں میں رائج تھیں اعتراض کرنے لگے۔ مگر عرصے تک انہیں کوئی ہم نوا نہیں ملا۔ اس کے بعد انہوں نے مکہ معظمہ کا سفر کیا اور پھر مدینہ منورہ گئے اور شیخ عبداللہ بن ابراہیم بن سیف کے شاگرد ہوئے اور وہاں انہوں نے روضہ رسول ﷺ پر دعائیں کرنے پر شدت سے برہمی کا اظہار کیا۔ پھر نجد گئے اور وہاں سے شام کے ارادے سے بصرہ گئے اور یہاں شیخ محمد مجموعی سے درس لیا اور اب بصرہ کے مسلمانوں کی باتوں پر اعتراض کرنے لگے تو وہاں کے مسلمان برافروختہ ہو گئے یہاں تک کہ انہیں بصورت فرار وہاں سے نکلنا پڑا۔ بالآخر وہ نجد کے شہر حریملہ میں پہنچے جہاں ان کے والد کا قیام تھا۔ اور عرصے تک ان سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مگر یہاں انہوں نے اہل نجد کے اکثر افعال و اعمال پر ''شرک۔ شرک'' کی آوازیں بلند کیں اور اُن کے والد نے ان کو اس سے منع کیا تو وہ ان کی بات بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے بلکہ ان سے برسر جنگ ہو گئے اور کچھ لوگ ان کی پارٹی میں شامل ہو گئے جس سے ان میں اور اہل حریملہ میں جنگ وجدال کی نوبت آئی۔

اب اُن کے والد شیخ عبدالوہاب کا ۱۱۵۳ھ میں انتقال ہو گیا تو انہوں نے اور زیادہ

۱۔ ان مضامین کو ابن آلوسی بغدادی کی کتاب ''تاریخ نجد'' کے مختلف مقامات سے اخذ کر کے ہم نے اپنی عبارت میں درج کیا ہے۔

شدّت کے ساتھ اپنے عقائد کا اعلان شروع کیا جس کے بعد اہل حریملہ اُن کے قتل پر تیار ہو گئے تو وہاں سے عینیہ کی طرف منتقل ہو گئے۔ یہاں کا حاکم اُس زمانے میں عثمان بن محمد بن معمر تھا جسے ابن عبدالوہاب نے وہ سبز باغ دکھایا کہ وہ اگر ان کا ساتھ دے تو تمام نجد کا حکمران ہو جائے گا۔ اس نے ان کی مدد کا بیڑا اٹھایا اور اب اس مادّی طاقت کا سہارا لے کر انہوں نے زور و شور کے ساتھ اپنی تبلیغ جاری کر دی اور جب عینیہ کے کافی آدمی اُن کے ساتھ ہو گئے تو انہوں نے زید بن خطاب کے مزار کا قبہ جو اس نواح میں تھا منہدم کرا دیا مگر یہ خبر احساء اور قطیف کے حکمران سلیمان بن محمد بن عزیز حمدی کو پہنچی تو انہوں نے بڑا سخت ناراضگی کا خط عینیہ کے حاکم عثمان کے پاس بھیجا کہ اس شخص کو قتل کرا دو۔ عثمان کو ابن عبدالوہاب سے گرویدگی تو تھی مگر سلیمان والی احساء کے مخالفت کی تاب نہ تھی، اس لئے اس نے خفیہ طریقے پر ابن عبدالوہاب کے پاس پیغام بھجوایا کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ اُنہوں نے اُسے بہت پامردی کی دعوت دی اور پورے نجد کا حکمران بننے کی امید یں دلائیں مگر وہ ان کے کہنے میں نہیں آئے اور سختی کے ساتھ فوراً چلے جانے کی تاکید کی۔ مجبوراً ١١٦٠ھ میں وہ وہاں سے نکل کر درعیہ پہنچے۔ یہ سرزمین ہمیشہ سے شیطانی تحریکوں کا مرکز بنی رہی تھی۔ یہ وہی یمامہ کی سرزمین ہے جہاں سے مسلمۂ کذاب اُٹھا تھا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہاں کا حکمران موجودہ سعودی حکومت کا مورثِ اعلیٰ قبیلۂ عنیزہ میں سے محمد بن سعود تھا۔

ابن عبدالوہاب نے کسی ذریعے سے اُس کی بیوی سے رابطہ قائم کیا اور اُسے تمام نجد کی حکمرانی کا خواب دکھایا۔ یہ محمد بن سعود ان کی باتوں میں آ گیا اور تن من دھن سے اُن کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اور مسلمانوں کو مشرک قرار دے کر بنامِ "جہاد" ان کے جان و مال اور عزت کے اتلاف کے لئے ابن عبدالوہاب کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

محمد بن سعود سے عہد و پیمان کی تکمیل کے بعد محمد بن عبدالوہاب شہر کے اندر داخل ہوئے اور ابن سعود نے ایک بہت بڑا لشکر مرتب کر کے اطراف و جوانب کے مزارات کو منہدم کرنے اور

جو مسلمان سدِ راہ ہوں، اُن کا خون بہانے کے لئے بھیج دیا، جنہوں نے پورے طور پر اس حکم کی تعمیل کی اور قتل و غارت کا بازار شدت کے ساتھ گرم کر دیا۔

جب یہاں پوری کامیابی حاصل ہوگئی تو اطراف و جوانب کے حکام کے پاس اطاعت و انقیاد کے لئے خطوط لکھے جن میں سے بعض نے مرعوب ہو کر بآسانی اطاعت قبول کر لی اور جنہوں نے توجہ نہیں کی، درعیہ کے لوگوں کو ان سے جنگ کرنے پر مامور کیا گیا۔ چنانچہ اطراف نجد اور اس کے آگے بڑھ کر احساء میں خونریز معرکے ہوئے جن کے بعد پورے نجد اور اس کے تمام قبیلوں پر قہر و غلبہ کے ساتھ آلِ سعود کی حکمرانی ہوگئی۔ یہاں تک کہ ۱۲۰۶ھ میں محمد بن عبدالوہاب نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی مگر حکومت آلِ سعود نسل در نسل اُس مسلک کی اشاعت میں عسکری طاقت کے ساتھ مصروف رہی۔

چنانچہ محمد بن سعود کے بعد اُس کا بیٹا عبدالعزیز ہوا۔ یہ بھی اطراف و جوانب میں فوجی مہمیں بھیجتا رہا اور عبدالعزیز کے بعد سعود ہوا۔ یہ اپنے باپ سے زیادہ سخت تھا۔ اُس نے مسلمانوں کو حج سے روک دیا اور سلطان ترکی کے خلاف خروج کیا۔ مگر اس کے بعد سرگرمیاں زیادہ تر علاقہ نجد میں محدود تھیں۔ یہاں تک کہ جنگ عظیم میں حکومت ترکی جرمنی کا ساتھ دینے کی وجہ سے انگریزوں کے غیظ و غضب کا شکار بنی اور جرمنی کی شکست سے کمزور بھی ہوگئی تو پہلے انگریزوں نے شریف مکہ سے حکومتِ ترکی کے خلاف خود مختاری کا علم بلند کرایا۔ پھر شریف مکہ سے ناراض ہو کر اُس وقت کے سعودی حکمراں سے جس کا نام بھی عبدالعزیز تھا مکہ پر حملہ کرا کے شریف مکہ کو جزیرہ قبرص میں لے جا کر نظر بند کر دیا اور حجاز پر بھی آلِ سعود کا قبضہ کرا دیا جس کے بعد سے اب تک سعودی حکمرانوں کا دارالسلطنت اگرچہ نجد میں ہے مگر وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سمیت تمام حجاز کے حکمران ہیں۔

پہلا باب

محمد بن عبدالوہاب کا عقیدہ جناب باری عزّ اسمہٗ کے باب میں

سب کو معلوم ہے کہ وہابی حضرات عموماً اپنے پیشوا کی پیروی میں خالص توحید کے دعویدار ہیں اور اپنے سوا تمام مسلمانوں کو مشرک سمجھتے ہیں لیکن جب خود ابن عبدالوہاب کی کتابوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص خالق متعال کے بارے میں اپنے پیش رو ابن تیمیہ کی پیروی میں ایسا عقیدہ رکھتا ہے جس سے خالق کا جمال و کمال مجروح ہوتا ہے اور اس کی یکتائی جو توحید حقیقی کا تقاضہ ہے، مجروح ہو جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ قرآن مجید کے وہ آیات جن کے بعض الفاظ اپنے ظاہری لغوی معنی کے لحاظ سے جسمیت کا تصور پیدا کرتے ہیں: یداہ مبسوطتان جس کے ایک لفظی معنی یہ ہیں کہ "اُس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں"۔ اور علی العرش استوی جس کا ایک مفہوم یہ ہے کہ "وہ عرش پر سیدھا ہو کے بیٹھا"۔ ان میں علمائے حق کا مسلک یہ ہے کہ چونکہ ان کا یہ مفہوم شانِ الٰہی کے خلاف اور عقلاً اس کے لئے غیر ممکن ہے، اس لئے اُن کا ایسا مفہوم سمجھنا چاہئے جس کی محاورات عرب کے لحاظ سے اُن الفاظ میں گنجائش بھی ہے۔ اور وہ شانِ الٰہی کے خلاف بھی نہیں جیسے ید کے معنی قدرت اور استواء کے معنی غلبہ و اقتدار، مگر ابن تیمیہ

اوران کی پیروجن کے پیش رواب آخر میں یہی شیخ ابن عبدالوہاب ہوئے، ان سب الفاظ کو اُن کے ظاہری لغوی معنی پر محمل کرتے ہیں اوران میں سے کسی میں بھی تاویل کے مخالف ہیں۔اس طرح اُن کا تصور یہ ہے کہ وہ واقعی عرش پر بیٹھا ہے۔اُس کے ہاتھ ہیں، پیر ہیں، پہلو ہے، آنکھیں ہیں، چہرہ ہے، زبان ہے، نفس ہے اور یہ سب چیزیں حقیقتاً ہیں۔وہ آواز کے ساتھ بات کرتا ہے اور چڑھتا، اترتا، آتا، جاتا، ہنستا، روتا ہے۔

یہ بالکل وہ تجسیم ہے جس کے کفر ہونے پر عامۃ المسلمین متفق ہیں۔مگر ان علمائے وہابیہ کی کتابیں ان باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ چنانچہ خود ابن عبدالوہاب کی ایک کتاب ہے "التوحید الذی ہو حق اللہ علی العبید" اس میں اس آیت قرآن کے ذیل میں کہ حتی إذا فزع عن قلوبهم قالوا ماذا قال ربكم قالوا الحق وهو العلي الكبير لکھا ہے:۔ (سورہ سبا آیت ۲۳)

"بیسویں بات :۔ صفات (یعنی زبان، دہن اور الفاظ کے ساتھ کلام وغیرہ) کا ثبوت ہے۔فرقۂ اشاعرہ (مسلمانوں کی اکثریت) جو تعطیل (یعنی اُس طرح کے صفات کی نفی) کا قائل ہے، اس کے خلاف ہے"۔

شارح نے اس کے ذیلی حاشیے (فٹ نوٹ) میں لکھا ہے:

"یہ اشعریہ فرقہ ابوالحسن اشعری کی طرف منسوب ہے اور اس فرقے نے اکثر صفات کا انکار کیا ہے جیسے اللہ کا اونچا ہونا اور تمام اپنے مخلوق سے الگ ہو کر عرش پر بیٹھنا اور اس کا محبت کرنا اپنے بندوں سے اور اس کا رحم ان پر اور اس کے رضامندی اُن سے اور اُس کا غضب وغیرہ وغیرہ مخالفت میں اس کی جو ان چیزوں کے بارے میں رسول خدا ﷺ اور ان کے اصحاب اور دیگر اسلاف صالحین سے وارد ہوا ہے"۔

اس کے بعد آخر کتاب میں ایک باب ہے اس مطلب پر اُن احادیث سے استدلال کے لیے جن سے اُن کے مسلک کی موافقت سمجھ میں آتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

"یہ باب اُن احادیث میں ہے جو ایک ارشادِ الٰہی کے متعلق ہے کہ انہوں نے اللہ کی اصل شان کو نہیں سمجھا ہے اور تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن"۔

ابن مسعود کی روایت ہے کہ ایک یہودی عالم رسول خدا ﷺ کے پاس آیا اور کہا:

"اے محمد! ہم (اپنی کتابوں میں) ایسا پاتے ہیں کہ اللہ تمام آسمانوں کو ایک انگلی میں لے گا اور زمینوں کو ایک انگلی میں اور درختوں کو ایک انگلی میں اور پانی کو ایک انگلی میں اور زمین کو ایک انگلی میں اور باقی تمام مخلوق کو ایک انگلی میں اور ان سب کو اس طرح لے کر کہے گا میں اصل بادشاہ ہوں"۔

اس پر پیغمبر ہنسنے لگے ایسا کہ ڈاڑھیں تک آپ ﷺ کی نمودار ہو گئیں، اس یہودی عالم کی بات کی تصدیق کے طور پر پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی:

وما قدروا اللہ حق قدرہٖ والارض جمیعا قبضتہ یوم القیمۃ والسموٰت مطویٰت بیمینہ سبحنہ وتعلیٰ عما یشرکون۔ (سورہ زمر، آیت ۶۷) ١

مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ پہاڑ اور درخت ایک انگلی میں، پھر وہ ان سب کو جنبش دے کر کہے گا میں بادشاہ ہوں، میں اللہ ہوں۔

بخاری کی ایک روایت میں ہے آسمانوں کو ایک انگلی پر، پانی اور زمین کو ایک انگلی پر اور دیگر تمام مخلوق کو ایک انگلی پر۔ اسے دونوں (بخاری اور مسلم) نے درج کیا ہے اور مسلم کی روایت ابن عمر سے یہ ہے کہ اللہ آسمانوں کو روز قیامت لپیٹ دے گا۔ پھر انہیں اپنے بائیں ہاتھ میں لے گا، پھر وہی کہے گا کہ میں بادشاہ ہوں، کہاں ہیں سرکش لوگ؟ کہاں ہیں اپنی بڑائی ظاہر کرنے

١۔ زمینیں تو ایک انگلی میں آ چکی ہیں۔ اب معلوم نہیں یہ زمین کیسی ہے جو ایک اور انگلی میں ہے۔

والے؟ اور ابن عباس سے روایت ہے کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں خدا کی ہتھیلی پر ایسی ہوں گی جیسے رائے کا دانا۔ تم میں سے کسی کے ہاتھ میں اور ابن جریر کا بیان ہے کہ مجھ سے یونس بن وحید نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ابوزید نے کہا کہ مجھ سے میرے والد نے بیان کیا کہا کہ رسول ﷺ خدا نے فرمایا کہ ساتوں آسمان کرسی میں بس ایسے ہیں جیسے سات درہم (چاندی کے سکے) کسی سپر (ڈھال) میں اور ابوزید نے یہ بھی کہا کہ میں نے پیغمبر ﷺ خدا کو فرماتے سنا کہ کرسی عرش کے اندر ایسی ہے جیسے لوہا کا ایک چھلا ایک بڑے جنگل کی پشت پر لنڈھک رہا ہو اور ابن مسعود سے روایت ہے کہ آسمان دنیا اور اُس سے ملے ہوئے آسمان کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے اور اسی طرح ہر آسمان کا فاصلہ پانچ سو برس کی راہ کا ہے اور پھر ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان پانچ سو برس کی راہ اور کرسی اور پانی کے درمیان پانچ سو برس کی راہ اور عرش پانی کے اوپر ہے اور اللہ عرش پر ہے، پھر بھی تمہارے اعمال میں سے کچھ اس پر پوشیدہ نہیں رہتا۔ اس کی ابن مہدی نے روایت کی ہے کہ حماد بن مسلمہ سے، انہوں نے عاصم سے، انہوں نے ذر سے، انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے، اور اسی سے ملتی جلتی روایت بھی ہے مسعودی نے عاصم سے، انہوں نے ابو وائل سے، انہوں نے عبداللہ سے، حافظ ذہبی نے کہا ہے کہ یہ حدیث کئی طریق سے وارد ہوئی ہے اور عباس ابن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا:

> ''تم جانتے ہو آسمان اور زمین کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اللہ اور پیغمبر زیادہ واقف ہیں۔ فرمایا ان کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے۔ اور ہر آسمان کو دوسرے آسمان سے فاصلہ پانچ سو برس کی راہ کا ہے، اور ہر آسمان کی ضخامت پانچ سو برس کی راہ کے برابر ہے، اور ساتویں آسمان اور عرش کے درمیان ایک سمندر ہے، اس کے نیچے اور اوپر کی سطح کے درمیان ویسا ہی فاصلہ ہے جیسا کہ آسمان اور زمین کے درمیان ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے

اوپر ہے اور پھر بھی اس پر آدمیوں کے اعمال میں کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی"۔

اس کی ابوداؤد نے تخریج کی ہے اور اس میں چند مسئلے ہیں:۔

پہلے اس آیت کی تفسیر کہ: والارض جمیعا قبضتہ یوم القیمۃ (زمین سب اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن)۔

دوسرے یہ کہ یہ اور ایسے ہی معلومات اُن یہودیوں کے پاس باقی تھے جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے۔ نہ انہوں نے انہیں غلط سمجھا تھا اور نہ ان کی تاویل کی تھی۔

تیسرے یہ کہ اس یہودی عالم نے جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی اور قرآنی آیت اس کی مطابقت میں نازل ہوئی۔

چوتھے یہودی عالم کے اس بڑے علم کو بیان کرنے کے بعد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہنسنا۔

پانچویں صراحت دونوں ہاتھوں کی اور یہ کہ آسمان داہنے ہاتھ میں ہوں گے اور زمینیں بائیں ہاتھ میں"۔

محمود شکری آلوسی نے جو خود وہابی المسلک تھے، "تاریخ نجد" میں "دین اہل نجد اور اُن کے افعال و اعمال" کے ذیل میں لکھا ہے کہ وہ صفات (یعنی ہاتھ، منہ وغیرہ) والے آیات اور احادیث کو ان کے ظاہری مفہوم پر برقرار رکھتے ہیں اور ان کے مطلب کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔

لیکن اگر وہ مطلب کو اللہ کے حوالے کرتے تو ان کے ظاہری مفہوم پر برقرار رہنے کا فیصلہ نہ کرتے۔

غور کرنے کے بعد ہر صاحب بصیرت شخص محسوس کر سکتا ہے کہ ان الفاظ کو ظاہری مفہوم پر محمول کرنا اسلامی تعلیم سے مطابقت نہیں رکھتا اس لئے کہ اس سے خالق متعال کی جسمیت لازم آتی ہے اور مجسمہ کے کفر پر تمام مسلمان متفق ہیں اس لئے کہ وہ اصول توحید کے خلاف ہے۔ امام المتقین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نہج البلاغہ کے پہلے ہی خطبے میں فرماتے ہیں:

"توحید کا مکمل ہونا یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے، اس لئے کہ

ہر موصوف اس کا گواہ ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کچھ ہے اور ہر صفت اس کی گواہ ہے کہ وہ موصوف کے علاوہ کچھ ہے تو جس نے اُس کے اوصاف مانے اُس نے اُسے ایک سے زیادہ مان لیا اور جس نے اُسے ایک سے زیادہ مانا اس نے اس کے اجزاء مان لئے"۔

ظاہر ہے کہ اگر خالق کے لئے اجزاء مان لئے جائیں تو یہ اجزاء یا واجب الوجود اور قدیم ہوں گے، یا حادث۔ اگر حادث ہوں تو خالق کی ذات حادث ہو جائے گی۔ اس لئے کہ حادث چیزوں سے مرکب چیز لازماً حادث ہوگی اور اگر واجب الوجود اور قدیم بالذات ہونے میں خالق کے ہمسر دوسرے ہو جائیں گے جو شرک ہے۔ اس کے علاوہ واجب الوجود کا محتاج ہونا آلات اور اجزاء کی طرف لازم آئے گا اور محتاج ہونے کا لازمہ حدوث و امکان ہے۔

رہ گئے وہ آیات و احادیث جن سے اس غلط عقیدے پر استدلال کیا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں لہٰذا ہر لفظ کے وہ معنی قرار دیے جانا چاہئیں جو عقل و نقل کے لحاظ سے صحیح قرار پاتے ہوں مثلاً استوار کی لفظ کا ایک سطحی مفہوم سیدھے بیٹھنے کا ہے لیکن محل کے لحاظ سے اس کا بالکل درست مفہوم قدرت و غلبہ کے ساتھ قائم و برقرار ہونا ہے جو بالکل اصول محاورہ کے مطابق ہے اور شایان شان الٰہی ہے۔ اسی طرح وجہ کے معنی وہ آثار قدرت ہیں جو معرفت الٰہی کا ذریعہ ہوتے ہیں جس کی نظیریں کلام عرب میں بکثرت ہیں۔ یونہی ید کے معنی تسلط و اختیار کامل کے ہیں۔

وہ یہودی عالم والی روایت جو بیان کی گئی ہے، در حقیقت اس عقیدے کے غلط ہونے کی دلیل ہے۔ اُس روایت میں یہودی کے قول پر حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہنسنے کے ساتھ یہ جملہ کہ "اُس یہودی کی بات کی تصدیق کے طور پر" یہ نہ کوئی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول ہے، نہ عمل جسے جزء حدیث سمجھا جائے بلکہ یہ اس روایت کے بیان کرنے والے کا تصور ہے جو اس کی ناسمجھی کی دلیل

ہے۔ قرین عقل یہ ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس یہودی کی حماقت پر اتنی شدت سے ہنسے اور یہ آیت اُس کی رد میں پڑھی کہ انہوں نے اللہ کو اس کی حقیقی شان کے ساتھ نہیں سمجھا۔ کائنات سب روز قیامت اُس کے قبضۂ قدرت میں ہوگی۔ نہ یہ کہ کائنات کی ایک ایک چیز کو وہ اپنی ایک ایک انگلی پر لے کر اُسے حرکت دینے کا کرتب دکھائے گا۔

اس خیال اور اس کے علاوہ دوسرے خیالات میں جن کا بعد میں ذکر آئے گا۔ ابن عبد الوہاب کے مقتدا ابو العباس احمد بن تیمیہ حرانی متوفی ۷۲۸ھ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ان باتوں پر زور دیا اور اس بارے میں مستقل رسالے لکھے جیسے عقیدہ حمویہ اور واسطیہ وغیرہ اور پھر ان کے شاگرد ابن القیم جوزیہ اور ابن عبد الہادی وغیرہ اُن کے قدم بقدم چلے۔ علمائے اسلام نے ان کے کفر کا فتویٰ صادر کیا اور بعض نے ان کے جواز قتل کا حکم دیا تاہم وہ ایک طویل مدت تک قید رہے۔

اس محل پر ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ابن تیمیہ کے بارے میں جو وہابی عقائد کے بانی مبانی ہیں، علمائے اسلام کے تصریحات درج کئے جائیں جن سے پتہ چلے کہ جب پیشوا کی حیثیت یہ ہے تو پیروؤں کی حیثیت کیا ہوسکتی ہے؟

علامہ ابن حجر مکی نے اپنی کتاب "جوهر منظم فی زیارة قبر النبی المکرم" میں لکھا ہے کہ:

> ''ابن تیمیہ کی لغزش ایسی ہے جس کا تدارک نہیں ہوسکتا اور ایسی معصیت ہے کہ جس کا وبال زوال پذیر نہیں۔ اس شخص کو نفسانی خواہش نے آمادہ کیا کہ وہ علم اجتہاد بلند کر کے تمام علمائے سلف کے خلاف بہت سے مسائل میں اُن کے اجماع کی مخالفت کرے اور پیشوایان دین یہاں تک خلفائے راشدین پر رکیک اعتراضات کرے، یہاں تک کہ بارگاہِ الٰہی

میں بھی گستاخی کرے۔ اس نے خدا کی شان جلال و جبروت کو صدمہ پہنچایا کہ عوام کے سامنے بالائے منبر صاف اُس کے جسم ہونے اور سمت خاص میں ہونے کا اعلان کیا اور جو اس کا انکار کرے، اُسے گمراہ قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ تمام علمائے زمانہ نے متفق ہوکر بادشاہ وقت کو اس کے قتل یا قید کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ اُس نے آخر عمر تک قید ہستی سے رہا ہونے تک اُسے قید رکھا[1] اور اس کے بعد یہ آگ ذرا خاموش ہوئی اور اندھیرے چھٹ گئے مگر پھر کچھ اس کے حامی وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے لیکن انہیں کوئی طاقت حاصل نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ ذلیل و رسوا اور غضب الٰہی میں گرفتار رہے"۔

انہوں نے اپنی دوسری کتاب "اشرف الوسائل الی فہم الشمائل" میں لکھا ہے:

"عمامے کو دونوں کاندھوں کے بیچ میں لٹکانے کے بارے میں کہ ابن قیم نے اپنے استاد ابن تیمیہ کے لئے کہا ہے کہ انہوں نے ایک نادر بات کہی ہے اور وہ یہ کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کو اپنا ہاتھ ان کے کاندھوں کے بیچ میں رکھے ہوئے دیکھا تو اس جگہ کو یہ امتیاز عطا کیا۔ عراقی نے کہا کہ ہمیں اس کی کوئی اصل نہیں ملی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ان دونوں (ابن تیمیہ اور ابن قیم) کے دوسرے خیالات کی طرح کی چیز ہے جو مبنی ہے اُس تصور پر جو ان کا ہے اور جس کے ثابت کرنے میں انہوں نے بہت طویل کلام سے کام لیا ہے اور اہل سنت پر طعن و تشنیع کی ہے کہ وہ اس کے منکر ہیں اور وہ اللہ کے لئے جہت اور جسم کا تجویز کرنا ہے (بالاتر

۱۔ یہ جز غیر یقینی ہے اس لئے کہ بعد میں ایک دوسرے مصنف کا بیان آئے گا کہ وہ دوبارہ رہا ہوئے اور بعد میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔

ہے اُس کی ذات ان ظالموں کے خیالات سے) اور ان کے یہاں اس مقام پر اتنی خراب اور بد اعتقادی کی باتیں ہیں جن سے کانوں کو اذیت ہوتی ہے اور فیصلہ یہی ہوتا ہے کہ یہ غلط، جھوٹ، گمراہی اور بہتان کی باتیں ہیں۔ اللہ اُن کا برا کرے اور برا کرے اُس کا جو اُن کے اقوال کا معتقد ہو اور امام احمد بن حنبل اور اُن کے مسلک کے بزرگ مرتبہ علماء اس برائی کے داغ سے بری ہیں اور کیونکر ایسا نہ ہو کہ یہ بہت سوں کے نزدیک کفر ہے"۔

ہمارے لکھنؤ کے مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی "حل المعاقد حاشية شرح عقائد" لکھتے ہیں کہ:

"تقی الدین ابن تیمیہ حنبلی شخص تھا مگر وہ حد سے آگے بڑھ گیا اور ایسی باتوں کے ثابت کرنے کا درپے ہوا جو عظمت وجلال خداوند عالم کے خلاف ہیں کہ اس کے لئے سمت جہت اور جسم مان لیا اور بہت سے اس شخص کے ہفوات ہیں مثلاً حضرت عثمان کے لئے کہا کہ وہ مال سے محبت رکھتے تھے اور حضرت علی علیہ السلام کے لئے کہا کہ اُن کا ایمان درست نہ تھا۔ اس لئے کہ بچپن میں ایمان لائے تھے اور اہل بیت پیغمبر علیہم السلام کے لئے ایسی باتیں کہیں جو کوئی مومن زبان پر نہیں لا سکتا۔ حالانکہ صحیح احادیث اُن کے مناقب میں کتب صحاح میں وارد ہوئے ہیں اور جلسہ قلعہ جبل میں ہوا اور وہاں اکابر علماء اس وقت کے جمع ہوئے جن کے راس ورئیس قاضی القضاۃ زین الدین مالکی تھے اور وہاں ابن تیمیہ کو بھی حاضر کیا گیا اور طولانی گفتگو کے بعد قاضی القضاۃ نے اُسے قید کرنے کا حکم دیا اور یہ ۵۰۷ھ کا واقعہ ہے۔ پھر دمشق وغیرہ میں اعلان ہوا کہ جو شخص ابن تیمیہ

کے عقیدے پر ہو اس کا جان و مال حلال ہے۔ اس کا ذکر مراۃ الجنان یافعی میں موجود ہے۔ پھر اس نے توبہ کی۔ اور ۷۰۷ھ میں قید سے رہائی پائی اور کہا میں "اشعری" مسلک کا پابند رہوں گا۔ پھر اس نے عہد کو توڑا اور اپنے عقائد کا اظہار کیا تو دوبارہ قید سخت کی سزا ہوئی۔ پھر توبہ کی اور قید سے رہائی ہوئی اور شام میں قیام کیا اور وہاں بہت سے واقعات اس سلسلے میں پیش ہوئے جو کتب تاریخ میں مذکور ہیں"۔

علامہ ابن حجر مکی نے "درر کامنہ" جلد اول میں اور ذہبی نے اپنی تاریخ میں اس کے اقوال و حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ بیان تو درمیان میں ضمناً آ گیا۔ اصل مطلب یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے چونکہ خدا کی جسمیت کو اختیار کیا لہٰذا کہا کہ اس کے لئے مکان ہے۔ اس لئے کہ ہر جسم کے لئے مکان ضروری ہے۔ اور چونکہ قرآن میں ہے "الرحمن علی العرش استویٰ" اس لئے کہا کہ عرش ہی اس کا مکان ہے۔ اور چونکہ خداوند عالم ازل سے ہے اور عالم کے تمام اجزاء حادث ہیں اس لئے اسے مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ جنس عرش ازلی اور قدیم ہے لیکن اس کی لامتناہی شخصیتیں یکے بعد دیگرے وجود میں آتی رہتی ہیں تو مکان میں ہونے کی صفت خدا کی قدیم ہے اور مکان کے تعینات حادث ہیں۔

مراۃ الجنان یافعی میں ابن تیمیہ کے فتنے کے ذکر میں ہے کہ مصر میں جو ان پر الزام عائد ہوا وہ یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ خدا حقیقتاً عرش پر بیٹھا ہے اور وہ حروف اور آواز کے ساتھ کلام کرتا ہے اور اسی کے بعد دمشق وغیرہ میں اعلان کیا گیا کہ جو ابن تیمیہ کے عقیدے پر ہو اس کا جان و مال حلال ہے۔

ابوالفداء نے اپنی تاریخ میں ۷۰۵ھ کے حالات میں لکھا ہے کہ اس میں تقی الدین احمد ابن تیمیہ کو دمشق سے مصر بلایا گیا اور ایک جلسہ ہوا جس میں بحث مباحثے کے بعد طے ہوا کہ وہ اب اعتقادات کے سبب جیل میں ڈال دیا جائے۔ اس لئے کہ وہ جسمیت کا قائل ہے۔

اس کے علاوہ ہماری نظر سے اس اشتہار کی کچھ عبارتیں بھی گزری ہیں جو بادشاہ کی

طرف سے اس شخص کے بارے میں شائع کیا گیا تھا۔ اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بدنصیب ابن تیمیہ نے اس مدت میں اپنے قلم کی زبان کو بڑھا رکھا تھا اور اپنے الفاظ کی باگ ڈھیلی کر رکھی تھی اور قرآن اور صفات الٰہی کے مسائل میں بحثیں اُٹھائیں اور اپنے کلام میں بہت سے غلط باتوں کی صراحت کی اور ایسی باتوں میں گفتگو کی جن سے صحابہ و تابعین نے خاموشی اختیار کی تھی اور وہ باتیں زبان پر لایا جو سلف صالحین کے لئے ناقابل قبول تھیں اور وہ اعتقادات ظاہر کئے جنہیں ائمہ اسلام نے غلط قرار دیا ہے اور جن کے خلاف تمام علمائے اسلام کا اجماع ہے اور اطراف ملک میں اس کے لئے ایسے فتوؤں کی اشاعت ہو رہی ہے جن سے عوام گمراہ ہو رہے ہیں اور اس بارے میں اس نے تمام علمائے عصر اور فقہائے شام و مصر کی مخالفت کی ہے۔ جب ہم تک یہ خبریں پہنچیں اور معلوم ہوا کہ ایک گروہ اُس کا بھی پیرو ہو گیا ہے اور وہ لوگ اللہ کے بارے میں حروف اور آواز اور جسمیت کی صراحت کرتے ہیں تو ہم اس کے خلاف کھڑے ہونے کے لئے مجبور ہوئے۔

یہ منشور کافی طولانی ہے جس کے کچھ جملوں کا مطلب لکھا گیا ہے۔

اس سب سے معلوم ہوا کہ اس طرح صفات الٰہی اور جسمیت کا اعتقاد وہ ہے جس کے کفر ہونے پر علمائے اسلام متفق ہیں۔ اب اس سے ابن عبدالوہاب اور ان کے پیروؤں کے متعلق رائے قائم کی جا سکتی ہے جو انہی باتوں کے قائل ہیں۔

سابق میں جو کچھ درج ہوا ہے، وہ اہل سنت کے تصریحات تھے اور علمائے شیعہ کے تصریحات مجسّمہ کے کفر کے متعلق شرح لمعہ، ریاض المسائل، مسالک اور جواہر الکلام تقریباً تمام فقہ جعفری کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس طرح پوری امت کا اجماع اُن کے کفر پر ثابت و متحقق ہو جاتا ہے۔

واللہ محیط بالکافرین

دوسرا باب

وہابی عقیدہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں

ابن عبدالوہاب اور اُن کے پیرو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد اپنی قبر میں مثل عام مرنے والوں کے ہو گئے نہ سنتے ہیں، اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ نہ آپ کو اس کا اختیار ہے کہ مشرق ومغرب میں جہاں چاہے جائیں۔ اس کے علاوہ آپ کی قبر مطہر کی زیارت کے لئے سفر کر کے جانا ان کے نزدیک حرام ہے۔ اور آپ کے ساتھ توسل اور آپ کی قبر کے پاس دعا مانگنا جائز نہیں ہے اور یا رسول اللہ کہہ کر پکارنا شرک ہے۔ جو وفات کے بعد آپ سے مخاطب ہو کر کوئی حاجت طلب کرے، وہ مشرک ہے کہ اس کا جان و مال حلال ہے۔ اس کو بخیال خود ثابت کرنے کے لئے وہ آیات واحادیث سے استدلال کرتے ہیں جو در حقیقت اس پر دلالت نہیں کرتے اور تمام مسلمان متفق ہیں کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعد وفات زندہ ہیں، نہ ایسی زندگی جو نص قرآن شہداء کے لئے بھی ثابت ہو بلکہ اُس سے بدرجہا زیادہ مکمل زندگی۔

یہ تصور کہ حضرت کی قبر مطہر کی زیارت کے لئے سفر کرنا ممنوع ہے، اس کی بنیاد ایک حدیث پر ہے جو اہل سنت کے یہاں وارد ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "سوا تین مسجدوں

کے کسی جگہ کے لئے شد رحال یعنی سفر کر کے جانا جائز نہیں ہے"۔ اسے جو اپنے مقصد کی دلیل بنا کر پیش کیا جاتا ہے، یہ غلط ہے۔ اس لئے کہ ذرا بھی جو عربی سے واقف ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسجدوں میں بس یہ تین مسجدیں ہیں جن کے لئے خاص طور پر سفر کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ مستثنیٰ منہ کا مستثنیٰ کی جنس سے ہونا ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں نے عمر بھر میں بس وہ مسجد دیکھی ہے اس کے سوا کوئی نہیں تو ہر ایک یہی سمجھے گا کہ مسجد کوئی اور نہیں دیکھی۔ یہ تھوڑی کہ کوئی عمارت دوسری یا کوئی چیز دوسری نہیں دیکھی۔ اسی طرح اس سے کہ سوا تین مسجدوں کے اور کسی کے لئے سفر نہ کیا جائے مسجدوں میں انحصار ثابت ہوگا، لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ روضۂ رسول کے لئے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ ورنہ پھر ایک شہر سے دوسرے شہر تجارت وغیرہ کے لئے بھی سفر جائز نہ ہونا چاہئے جس کا غلط ہونا ظاہر ہے اور کئی مرتبہ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بسلسلہ تجارت شام کا سفر فرمایا اور اس کا ثبوت ملتا ہے۔ امام احمد بن حنبل کی روایت سے جس کا مضمون یہ ہے کہ کسی مسجد کی طرف جہاں ذکر الٰہی ہوتا ہے سفر کر کے جانا جائز نہیں ہوگا سوا تین مسجدوں کے۔ اسے سید مصطفیٰ نور الدین حسینی نے اپنی کتاب "خلاصة المقال فی شد الرجال" میں درج کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حدیثیں ایک دوسرے کی تشریح کرتی ہیں۔ اور حکم مطلق کی وضاحت مقید سے ہوتی ہے اور برابر تمام مسلمان اور ہر دور کے علماء روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لئے سفر کرتے رہے اور کسی نے بھی کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اس سے تمام مسلمانوں کا اجماع واتفاق ثابت ہوتا ہے اور جن لوگوں نے بعد میں اس کے مخالف راہ اختیار کی، وہ جماعت سے نکل گئے اور اجماعی راستے سے منحرف ہو گئے۔

بعض احادیث سے بھی زیارت کے لئے سفر کا ثبوت ملتا ہے۔ جیسا کہ علی ابن برہان الدین شافعی کی کتاب "انسان العیون" میں ہے کہ:

"جب جناب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی وفات ہو گئی تو بلالؓ شام کی طرف

چلے گئے اور کہا اب رسول خدا ﷺ کے بعد مدینے کی صورت نہیں دیکھوں گا۔ عرصے تک وہاں رہے مگر ایک شب رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں: اے بلال! تم نے ہمارا جوار چھوڑ دیا اور شام میں قیام کرلیا تو کیا اب ہماری زیارت کے لیے بھی نہیں آتے؟ پس جونہی وہ بیدار ہوئے انہوں نے سفر کی تیاری کر دی اور مدینہ آئے اور قبر پیغمبر ﷺ کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے"۔

اور یہ احادیث صحاح سے ثابت ہے کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا اس نے حضرت ﷺ ہی کو دیکھا ہے۔ اس لیے کہ شیطان حضرت ﷺ کی صورت میں نہیں آسکتا۔ اس سے سفر کرنا زیارت قبر رسول ﷺ کے لیے خود حکم رسول ﷺ سے ثابت ہو جاتا ہے جس سے انکار کی کسی کو گنجائش نہیں ہے۔

ابن عبدالوہاب نے اس قول کو بھی اپنے پیش رو ابن تیمیہ اور ابن قیم سے لیا ہے کہ ان دونوں نے سب سے پہلے یہ صدا بلند کی اور اسے ثابت کرنے میں طول کلام سے کام لیا اور علمائے اسلام نے اس کی رد میں مستقل کتابیں تحریر کیں جیسے "شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام" جو آٹھویں صدی کے قاضی القضاۃ شیخ حافظ تقی الدین حسن سبکی کی تصنیف ہے اور "جوہر منظم فی زیارۃ قبر النبی المکرم" از علامہ ابن حجر مکی ہیتمی اور "منتھی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال" از سید مصطفیٰ نور الدین الحسینی وغیرہ وغیرہ۔

یہاں کچھ ان کتابوں کے اقتباسات اور کچھ دیگر علماء کے ارشادات جو ضمناً دوسری کتابوں میں اس موضوع سے متعلق ہیں، درج کیے جاتے ہیں۔

علامہ سبکی نے اپنی کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ:

بارگاہ الٰہی میں تقرب کے بہترین اسباب میں سے حضرت سرور

کائنات ﷺ کی قبر مطہر کی زیارت اور اطراف عالم سے اس کے لئے سفر ہے جیسا کہ شرق وغرب کے تمام مسلمانوں میں سالہا سال سے جاری وساری ہے اور ان باتوں میں جو شیطان نے اس زمانے میں بعض بد نصیبوں کی زبان پر جاری کی ہیں اس میں شک پیدا کرتا ہے اور یہ شک اُن کے دل میں ہر گز نہیں آسکتا جو سچے معنی میں مسلمان ہوں اور یہ ایک وسوسہ ہے ایسے بد نصیب کا پیدا کیا ہوا جس کا وبال اس پر آئے گا اور اس پر وہی احکام جاری ہوں گے جو قانون الٰہی نے صاف طور پر ایسے اشخاص کے لئے نافذ کئے ہیں اور باطل شبے فنا ہو کر رہتے ہیں"۔

دوسری جگہ اس کتاب میں لکھا ہے:

"ابن تیمیہ کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں اور دینی اصول اور اسلاف صالحین کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت سے نیکوکار و پرہیزگار اموات کے آثار کو متبرک سمجھتے رہے ہیں۔ چہ جائیکہ انبیاء و مرسلین اور جو اس کا دعویٰ کر کے انبیاء کے مقدس قبور اور عام مسلمانوں کی قبریں یکساں ہیں، اس نے انتہائی غلط دعویٰ کیا جس کے باطل ہونے کا ہم یقین رکھتے ہیں، اور اس میں رسول خدا ﷺ کے مرتبے کو عام مسلمانوں کی سطح تک گھٹاتا ہے اور یقیناً داخل کفر ہے۔ اس لئے کہ جو رسول ﷺ کے رتبے کو اُس کی شایانِ شان سطح سے گرائے وہ کافر ہے اور اگر وہ کہے کہ یہ گرانا نہیں ہے بلکہ اُن کے مناسب درجے سے اُن کی عظمت کو بڑھانے سے روکنا ہے تو یہ بھی جہالت اور گستاخی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ پیغمبر ﷺ خدا اس سے بھی زیادہ تعظیم وتکریم کے مستحق ہیں، زندگی میں بھی اور اپنی

وفات کے بعد بھی اور اس میں شک نہیں کرسکتا وہ جس کے دل میں ذرا بھی ایمان ہو"۔

علامہ ابن حجر جوہر منظم میں لکھتے ہیں:۔

"اگر تم کہو کہ ہم زیارت قبر مطہر اور اس کے لئے سفر کے مطابق شرع ہونے پر اجماع کیونکر مان سکتے ہیں حالانکہ حنبلی جماعت میں سے ابن تیمیہ اس سب کے موافق شرع ہونے کے منکر ہیں جیسا کہ بکی نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ ابن تیمیہ نے اس پر بہت طولانی استدلال کیا ہے بلکہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سفر اس زیارت کے لئے اجماعاً حرام ہے۔ اور اس میں نماز قصر نہ ہوگی اور یہ کہ جتنی حدیثیں اس کی فضیلت میں ہیں سب وضعی ہیں اور بعد میں بھی کچھ علماء نے اس قول کی پیروی کی ہے تو میں کہوں گا کہ ابن تیمیہ کون ہے جس کی طرف نظر ڈالی جائے اور دین کے معاملات میں سے کسی میں اُس پر بھروسا کیا جائے اور وہ تو جیسا کہ ایک جماعت نے جیسے عزبن جماعہ، اُس کے اقوال اور بے قیمت دلائل کا جائزہ لیا ہے اور اس کے توہمات اور غلطیوں کا اظہار کیا ہے، ایک ایسا شخص ہے جسے اللہ نے گمراہیوں میں داخل کیا ہے اور اُسے رسوائی کی چادر اُڑھا دی ہے اور ہلاکت کا مستحق قرار دیا ہے اور انتہائی افترا پردازی اور دروغ بیانی سے اُس نے اپنے لئے وہ جگہ بنائی ہے جو اس کی سبکی اور رحمتِ خدا سے محرومی کا سبب ہے اور شیخ الاسلام تقی سبکی نے جن کی بزرگی، اجتہاد، پرہیزگاری اور پیشوائی مسلّم ہے اُس کی رد میں ایک مستقل کتاب تحریر کی ہے اور اُس میں مستحکم دلائل سے صحیح راستے کو واضح کیا ہے"۔

مفتی صدر الدین نے منتہی المقال میں لکھا ہے کہ:

''بزرگ مرتبہ عالم متبحر، محدثین کے محل استناد شیخ محمد بریسی نے اپنی کتاب ''اتحاف اهل العرفان برویة الانبیاء والملائکه والجان'' میں لکھا ہے کہ ابن تیمیہ حنبلی نے جرأت وجسارت سے کام لیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر کی زیارت کے لئے سفر حرام ہے اور یہ کہ نماز اس سفر میں قصر نہ ہوگی۔ اس لئے کہ یہ سفر معصیت ہے اور اس میں ایسے طول کلام سے کام لیا ہے جس کے سننے سے کان انکاری ہیں اور طبیعتیں متنفر ہوتی ہیں اور اس کلام کی نحوست اُس کے شامل حال رہی۔ یہاں تک کہ اُس کی جسارت بارگاہ عز وجلال حضرت باری تک پہنچ گئی اور اس نے عظمتِ خالق کے پردے کو شگافتہ کر دیا اور ایسی باتوں کے ثابت کرنے کی کوشش کی جو اس کی شانِ عظمت وکمال کے خلاف ہیں کہ خدا کے لئے سمت وجہت اور جسمیت کا دعویٰ کیا اور جو اسے نہ مانے اُسے گمراہ اور گناہگار قرار دیا اور اس کا منبروں پر اعلان کیا اور اس کا چرچا ہر طرف پھیلا اور علمائے مجتہدین کی جو اس کے پہلے ہوئے ہیں بہت سے مسئلوں میں مخالفت کی اور خلفائے راشدین پر لچر اور پوچ اعتراضات کئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخص اس سے دور کے تمام علماء کی نظر سے گر گیا اور عوام وخواص سب میں اُس پر انگشت نمائی ہوئی اور علماء نے اُس کے غلط اقوال کا جائزہ لیا اور اس کے دلائل کی رد کی اور اُس کی لغزشوں کو نمایاں کیا اور اس کے توہمات اور غلطیوں کو واضح کیا''۔

احمد بن شہاب الدین خفاجی نے ''نسیم الریاض شرح شفاء قاضی

عیاض" میں اس حدیث رسول ﷺ کے درج کرنے کے بعد کہ "اللہ لعنت کرے یہود و نصاریٰ پر کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو محل سجدہ بنا دیا" لکھا ہے:

"معلوم ہونا چاہیے کہ اس حدیث کی وجہ سے ابن تیمیہ اور اس کے تابعین جیسے ابن قیم نے اپنا وہ رسوائے زمانہ تصور قائم کیا جس کی وجہ سے سب نے انہیں کافر قرار دیا اور سبکی نے ایک مستقل کتاب اس پر لکھی اور وہ زیارتِ قبر رسول ﷺ اور اس کے لئے سفر کو ممنوع قرار دینا ہے۔ انہوں نے بخیالِ خود توحید کے پہلو کا تحفظ کیا ایسے مہملات کے ساتھ جن کا ذکر بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ وہ کسی صاحب عقل کی زبان پر نہیں آسکتے، چہ جائیکہ کسی فاضل آدمی کی زبان پر"۔

ملا علی قاری نے شرح شفاء کی دوسری جلد میں لکھا ہے کہ:

"حنبلیوں میں سے ابن تیمیہ نے تفریط سے کام لیا کہ زیارتِ رسول ﷺ کے لئے سفر کو حرام قرار دیا جس طرح دوسروں نے افراط سے کام لیا کہ انہوں نے کہا کہ زیارت کا داخل عبادت ہونا ضروریاتِ دین میں سے ہے۔ اور اس کے منکر پر حکم کفر جاری ہے اور غالباً یہ دوسرا تصور حقیقت سے زیادہ قریب ہے اس لئے کہ جس چیز کے مستحب ہونے پر اجماع علماء ہو اس کا حرام کہنا کفر ہوگا اس لئے کہ یہ بالاتر ہے اس کے کہ کسی متفقہ طور پر مباح چیز کو حرام کہا جائے جس کے کفر ہونے پر اتفاق ہے"۔

کشف الظنون میں ہے کہ علماء نے ابن تیمیہ کے بارے میں بڑے افراط سے کام لیا ہے کہ صراحتہً لکھا ہے کہ:

"جو ابن تیمیہ کو "شیخ الاسلام" کہے وہ بھی کافر ہے"

ان تمام عبارتوں سے معلوم ہوا کہ بہت سے علماء ابن تیمیہ کے کفر پر اس قول کی وجہ

سے متفق ہیں۔

شیخ ابن حجر مکی نے ''درر کامنہ'' میں لکھا ہے کہ:۔

''لوگ ابن تیمیہ کے بارے میں کئی قسم کے ہیں۔ کچھ تو اُسے مجسمو میں داخل کرتے ہیں چونکہ عقیدۂ حمویہ اور واسطیہ وغیرہ میں لکھا ہے کہ ہاتھ اور پیر اور پنڈلی اور چہرہ سب حقیقتاً اللہ کے لئے ثابت ہیں۔ اور وہ بذاتِ خود عرش پر بیٹھا ہوا ہے۔ کہا کہ اس سے مکان خاص میں ہونا اور اس کا اجزاء پر تقسیم ہونا لازم آتا ہے تو کہا ہم یہ نہیں مانتے کہ مکان خاص میں ہونا اور اجزاء کا ہونا جسم کے خصوصیات میں سے ہے تو کہا گیا کہ بہر حال یہ شخص خدا کو لامکان نہیں مانتا اور اس کے لئے جز ومکان کا قائل ہے اور کچھ لوگ اُسے بے دین اس لئے مانتے ہیں کہ اس کا قول ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فریاد نہیں کی جاسکتی۔ اس میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تنقیص ہے اور آپ کی تعظیم سے روکنا ہے۔ سب سے زیادہ تشدد اس بارے میں نور بکری کو تھا کہ جب اس بارے میں اجتماع ہوا تو بعض حاضرین نے کہا کہ اس شخص کو تعزیر لازم ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کے کوئی معنی نہیں اس لئے کہ اگر اس سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تنقیص ہوتی ہے تو حکم قتل ہونا چاہیے اور اگر تنقیص نہیں ہوتی تو حکم تعزیر بھی کیوں ہو؟ کچھ لوگ منافق کا حکم جاری کرتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں یہ کہنے سے کہ انہوں نے جدھر بھی رُخ کیا وہ ناکام و نامراد رہے اور انہوں نے کئی دفعہ خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر نہیں پاسکے اور انہوں نے جنگیں صرف اقتدار کے لئے کیں، نہ کہ دین کے لئے اور وہ اقتدار کے خواہش مند اور عثمان

مال دنیا سے بڑی محبت رکھتے تھے اور اُس کا یہ قول ہے کہ ابو بکر بوڑھے تھے، سمجھتے تھے کیا کہہ رہے ہیں اور علی علیہ السلام بچپن میں ایمان لائے اور بچے کا اسلام قابل قبول نہیں۔ اور دختر ابو جہل کی خواستگاری کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے، اس سب میں حضرت علی علیہ السلام کے خلاف طعن و تشنیع ہے۔ اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے جو حضرت علی علیہ السلام سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمائی تھی کہ "تمہیں دشمن نہیں رکھے گا کوئی سوائے منافق کے"۔

کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ شخص امام اُمت بننے کا خواب دیکھتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ابن تومرت کا بہت ذکر کرتا تھا اور اس کی تعریفیں کرتا تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے وہ طولانی مدت تک قید میں رکھا گیا اور اس سلسلے میں بہت سے واقعات ہیں جو مشہور ہیں اور وہ جب قائل کیا جاتا تھا تو کہہ دیتا تھا کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرا مطلب دوسرا تھا اور پھر ایک بہت دور دراز کا مفہوم بیان کر دیتا تھا"۔

ان تمام علماء کے اقوال سے ثابت ہو گیا کہ زیارت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے سفر کے استحسان پر مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہے اور جو اس کا منکر ہے وہ ضروریات دین میں سے ایک چیز کا منکر ہے۔

بحثِ توسّل

توسّل رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے سے اللہ کی بارگاہ میں، اس کے لئے قرآن مجید سے بھی ثبوت موجود ہے اور بکثرت احادیث بھی ہیں اور صحابہ و تابعین کے آثار بھی اور پھر تبع تابعین اور تمام اُمت اسلامیہ کا عملدر آمد بھی ہے۔ جن میں سے ہر ایک یکے بعد دیگرے ذیل میں درج ہے۔

قرآن مجید سے توسّل کا ثبوت

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کر کے قرآن مجید میں ارشاد حضرت احدیت ہے کہ:

"کیوں نہیں ہوا ایسا کہ جب انہوں نے (گناہوں کے ارتکاب سے) اپنے اوپر ظلم کیا تھا تو وہ آپ کے پاس آتے اور آکر اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے لیے استغفار کرتے تو اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے"۔

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے توسّل مطلوب نہ ہوتا تو بجائے خود اُن کا استغفار کافی تھا۔ یہ حکم نہ دیا جاتا کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں اور آپ کے پاس آکر استغفار کریں اور اس کی ضرورت نہ ہوتی کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لیے استغفار کریں۔ ظاہر ہے کہ خداوندِ عالم بذاتِ خود "تواب الرحیم" ہے مگر یہاں اُس نے اپنے تواب و رحیم ہونے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر توسّل کے مطلوب الٰہی ہونے کی دلیل کیا ہو سکتی ہے۔

اَحادیث و آثار صحابہ و تابعین

(۱)

جنابِ آدم کا توسّل

اس کا ذکر متعدد احادیث میں ہے۔ منجملہ اُن کے وہ ہے جسے حاکم مستدرک میں درج کیا ہے اور اُسے صحیح قرار دیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے "ترکِ اولیٰ" ہوا تو انہوں نے کہا پروردگارا! میں تجھ سے محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش

دے۔ ارشادِ الٰہی ہوا کہ اے آدم! تم نے انہیں کیونکر پہچانا؟ عرض کیا کہ اس وجہ سے کہ جب تو نے مجھے خلق کیا تو میں نے عرش پر نظر ڈالی تو اس میں لکھا ہوا دیکھا "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ اُن کا نام میں نے تیرے نام کے ساتھ دیکھا تو سمجھا کہ وہ تمام خلق میں تجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں"۔

(۲)

بطور نمونہ عمل خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا توسل

طبرانی کی روایت ہے معجم کبیر اور اوسط میں، نیز ابن حبان اور حاکم نے صحیح ہونے کی تصدیق کے ساتھ انس بن مالک کی زبانی درج کیا ہے کہ جب جناب فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات ہوئی جنہوں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش کی تھی تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے سرہانے بیٹھے اور کہا اللہ کی رحمت آپ کے شاملِ حال ہو اے میری ماں کے بعد میری ماں! اس کے بعد جب لحد بنانے کا وقت آیا تو اپنے ہاتھ سے اُسے کھودا اور اس کی مٹی اپنے ہاتھ سے نکالی اور جب لحد تیار ہوگئی تو حضرت خود اس میں لیٹے اور کہا" اللہ جو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے اور وہ خود زندہ ہے ایسا جسے موت نہیں۔ پروردگارا! میری ماں فاطمہ بنت اسد کی مغفرت فرما اور ان کے محل میں وسعت عطا فرما۔ تجھے واسطہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن پیغمبروں کا جو میرے پہلے تھے۔ تو تمام رحمت والوں میں سب سے زیادہ رحمت والا ہے"۔

اور ابن ابی شیبہ نے ایسی ہی روایت جابر کی زبانی نقل کی ہے اور اسی طرح ابن عبد العزیز نے ابن عباس سے اور ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں انس سے۔

ان تمام روایات کا ذکر حافظ سیوطی نے جامع کبیر میں کیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خود توسل کی ضرورت نہ تھی مگر اپنی امت کو اس طریقے کے اختیار کرنے کی تعلیم دینا تھی۔

(۳)

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے سے جناب ابوطالب علیہ السلام کا طلب باراں

عم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوطالب علیہ السلام نے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساتھ لے جا کر طالب باراں کیا۔ فوراً باران رحمت آ گیا۔ اس پر انہوں نے ایک قصیدہ کہا جس کے دو شعر اس مضمون کے تھے کہ:

"وہ گورا چٹا جس کے چہرے کے ذریعے سے ابر سے بارش حاصل کی جائے۔ وہ یتیموں کا جائے پناہ اور رانڈوں کے لئے سبب حفاظت ہے۔ پناہ لیتے ہیں اس کی طرف بنی ہاشم کے تباہ حال افراد تو وہ اُس کے پاس احسانات میں گھرے رہتے ہیں"۔

ان اشعار کو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنا پسند فرمایا کہ بعد میں ان اشعار کو اور اُن کے نظم کرنے والے ابوطالب علیہ السلام کو یاد فرمایا جسے حافظ جلال الدین سیوطی نے خصائص کبریٰ میں درج کیا ہے۔

(۴)

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طلب باراں پر ایک شاعر کے اشعار

سیوطی نے خود حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طلب باراں کے بعد بارش ہونے کے ذکر میں لکھا ہے کہ قبیلۂ کنانہ کے شاعر نے اس سلسلے میں اشعار پڑھے وہ اشعار سیوطی نے درج کئے ہیں۔ ان میں اس شاعر نے جناب ابوطالب علیہ السلام کے اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے اور کہا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے کے ذریعے سے ہمیں بارش نصیب ہوئی اور وہ ایسے ہی ثابت ہوئے جیسا کہ ان کے چچا ابوطالب علیہ السلام نے ان کے بارے میں کہا تھا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس شاعر کی تعریف فرمائی اور اس طرح اُس کے ان الفاظ کی تصدیق فرمائی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے کی بدولت ہمیں بارش نصیب ہوئی۔

(۵)

ایک نابینا کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم

بخاری نے اپنی تاریخ میں اور بیہقی نے دلائل میں صحت کی تصدیق کرتے ہوئے اور ابونعیم نے کتاب المعرفہ میں عثمان بن حنیف سے روایت کی ہے کہ ایک نابینا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر کہنے لگا کہ اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے بینائی عطا فرمائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چاہو تو صبر کرو اور دعا نہ کراؤ اور چاہو تو دعا کر دوں۔

ابن ماجہ کی روایت میں یوں ہے کہ چاہو تو اللہ سے دعا کروں اور چاہو تو صبر کرو کہ وہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

بہر صورت اس نے کہا آپ دعا کر دیجئے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اچھا تو پھر پوری عمدگی کے ساتھ وضو کرو، پھر دو رکعت نماز پڑھو اور اس کے بعد ان الفاظ کے ساتھ دعا کرو کہ پروردگارا! تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں تیرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے سے جو رحمت کے پیغمبر ہیں اور اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے آپ کے واسطے سے رُخ کیا ہے اپنے اللہ کی طرف کہ وہ میری اس حاجت کو پورا کرے۔ پروردگارا! تو ان کی سفارش کو میرے بارے میں قبول فرما۔ جب اس شخص نے ایسا ہی کیا تو اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

(۶)

سواد بن قارب کے اشعار

طبرانی نے معجم کبیر میں سواد بن قارب کا واقعہ لکھا ہے۔ اس میں ہے کہ انہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا۔ اُس میں تھا کہ تمام پیغمبروں میں آپ کا وسیلہ اللہ کے یہاں سب سے زیادہ قریب ہے اور پھر یہ کہ ”آپ میری شفاعت کیجئے گا۔ ان میں سے کسی بات

پر حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعتراض نہیں فرمایا۔

(۷)

خلیفۂ اول ابوبکر کا توسل

شرح دلائل الخیرات میں حضرت ابوبکر سے متعلق ہے کہ وہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر پر آئے اور کہا:

''اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں آپ سے توسل کرتا ہوں''۔

(۸)

اُمّ المومنین عائشہ کا توسل

عماد الدین عامری کی کتاب ''بہجۃ المحافل'' میں ہے کہ اہل مدینہ شدید قحط میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے جناب عائشہ سے شکایت کی۔ انہوں نے کہا:

''پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر پر چھت میں ایک روشن دان کر دو کہ اس کے اور آسمان کے بیچ میں کوئی چیز حائل نہ رہے۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا تو شدید بارش ہوئی کہ نباتات اور حیوانات سب پر اُس سیرابی کا خوشگوار اثر ہوا''۔

(۹)

خلیفۂ ثانی عمر کا توسل

حافظ ابو نعیم اصفہانی نے ''دلائل النبوۃ'' میں انس کی زبانی لکھا ہے کہ حضرت عمر طلب باراں کے لئے نکلے اور عباس بن عبدالمطلب کے ذریعے سے طلب باراں کرتے ہوئے کہا:

''خداوندا! پہلے جب قحط پڑتا تھا تو ہم تیرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے توسل کرتے تھے اور اب ہم اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کے ذریعے سے تجھ

سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں بارش سے سیراب فرما"۔

چنانچہ بارش ہوئی۔

اس واقعے کو جاحظ نے "البیان والتبیین" میں دو جگہ درج کرنے کے بعد لکھا ہے کعب الاحبار نے حضرت عمر سے کہا کہ بنی اسرائیل جب قحط میں مبتلا ہوتے تھے تو پیغمبروں کے پدری رشتہ داروں کے ذریعے سے طلب باراں کرتے تھے۔ ان کے اس کہنے سے حضرت عمر نے جناب عباس بن عبدالمطلب کے ذریعے سے طلب باراں کیا۔

تاریخ میں ہے کہ جب بارش ہوئی تو لوگ جناب عباسؓ سے تمسح کرنے لگے۔ ہاتھ اُن کے جسم سے لگا کر اپنے چہرے پر پھیرنے لگے اور کہتے تھے مبارک ہو آپ کو اے حرمین (مکے و مدینے) کو سیراب کرنے والے۔ چونکہ عباس دور اسلام سے قبل اور پھر بعد اسلام ساقی الحجیج یعنی مکہ معظمہ کے حجاج کو پانی پلانے کے انتظام کے ذمہ دار تھے۔ اس طرح حرم خدا (مکہ معظمہ) کے لوگوں کو سیراب کرنا اُن کا کام تھا اور آج وہ اس باران رحمت کے نزول کا سبب بن کر حرم رسول ﷺ یعنی مدینے کے سیراب کرنے والے ثابت ہیں۔ لہٰذا ان کو سب "ساقی الحرمین" کہہ رہے تھے لیکن کسی نے ان لوگوں کا منہ بند نہیں کیا کہ یہ شرک ہے؟ اس کا ذکر ابن اثیر جرزی نے "اسد الغابۃ" میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس بارے میں حسان بن ثابت نے اشعار کہے جن میں ہے کہ "لوگوں نے قحط سالی کی شدت میں سوال کیا تو عباس کے چہرے کے واسطے سے اَبر نے باراں سے سیراب کیا"۔

اس شعر میں توسّل بھی ہے اور سیراب کرنے کی نسبت خدا کی طرف نہیں؟ اَبر کی طرف ہے جو وہابی نقطۂ نظر سے شرک ہے۔

(پھر کہا ہے) "ان کی بدولت اللہ نے ان شہروں کو زندہ کر دیا اور چاروں طرف شادابی نظر آنے لگی"۔

ایک روایت میں ہے جو جناب ابن عباس رضوان اللہ علیہ کی زبانی ہے کہ حضرت عمر نے کہا:
''خداوندا! ہم تجھ سے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کا واسطہ دے کر سیرابی طلب کرتے ہیں اور ان کی سفید داڑھی کو سفارش کے لئے لائے ہیں۔ اس کے بعد بارش ہوئی۔

(۱۰)

قبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جا کر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فریاد

استیعاب ابن عبد البر میں ہے کہ زمانہ عمر میں ایک دفعہ جو قحط پڑا تو مسلمانوں میں سے ایک شخص بیہقی نے لکھا ہے کہ وہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے بلال بن حارث تھے۔ یہ قبر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آئے اور کہا یا رسول اللہ! اپنی اُمت کے لئے طلب باراں کیجئے کہ یہ ہلاک ہو رہے ہیں۔ اس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

(۱۱)

نابغۂ جعدی کی قبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فریاد

خلیفہ سوم عثمان کے زمانے میں عمال حکومت نے نابغۂ جعدی کے ساتھ تشدد سے کام لیا تو نابغہ نے کچھ اشعار نظم کئے جن میں کہا ہے کہ:

''اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے دونوں ساتھیوں کی قبر! ہم آپ سے فریاد کر رہے ہیں''۔

اور یہ نابغہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بزرگ مرتبہ صحابی ہیں۔

(۱۲)

عبداللہ بن عمر کی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا سے فریاد

شفاء قاضی عیاض میں ہے کہ عبداللہ بن عمر کے پیر میں ایک دفعہ خاص تکلیف ہو

گئی۔ کسی نے کہا جو سب سے زیادہ آپ کا محبوب ہو، اُسے پکاریئے۔ انہوں نے کہا:

"وامحمداہ"

بس یہ کہتے ہی اُن کے پیر کی تکلیف دور ہوگئی۔

(۱۳)

عثمان بن حنیف کی توسّل کے لئے ہدایت

بیہقی نے اور ابونعیم نے کتاب المعرفۃ میں درج کیا ہے۔ سہل بن حنیف کا بیان ہے کہ ایک شخص خلیفۂ سوم عثمان کے پاس کسی ضرورت سے جاتا تھا اور وہ اُس کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ اُس نے عثمان بن حنیف سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا جا کر وضو کرو۔ پھر مسجد میں جا کر دو رکعت نماز پڑھو۔ پھر کہو خداوندا! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف رُخ کرتا ہوں، تیرے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی رحمت کے ذریعے سے، یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں آپ کے ذریعے سے اپنے پروردگار کی طرف رُخ کرتا ہوں کہ میری یہ حاجت پوری ہو۔ اس کے بعد اپنی حاجت کا اظہار کرنا، چنانچہ اس نے ایسا کیا اور پھر جناب عثمان بن عفان کے دروازے پر گیا تو دربان آیا اور وہ اُسے عثمان کے پاس لے گیا۔ انہوں نے اُس کو اعزاز کے ساتھ بٹھایا اور کہا بتاؤ! تمہاری کیا ضرورت ہے؟ اور اس ضرورت کو پورا کردیا۔

(۱۴)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے طلبِ شفا

صحیح مسلم میں اور اسماء بنت ابی بکر سے روایت ہے کہ اُنہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جبہ نکال کر دکھایا اور کہا یہ عائشہ کے پاس تھا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے پہنتے تھے اب ہم اسے دھو کر مریضوں کو پانی پلاتے ہیں اور اس کے ذریعے سے شفا حاصل کرتے ہیں۔ اے وہابی جماعت

کے مقتدا ابن قیم نے بھی اپنی کتاب "زاد المعاذ" میں درج کیا ہے۔

(۱۵)

عبداللہ بن زبیر عمر کا توسل

ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں شعبی کی روایت درج کی ہے کہ میں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ ہم لوگ صحن کعبہ میں بیٹھے تھے۔ میں اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر اور مصعب بن زبیر اور عبدالمالک بن مروان۔ نماز کے بعد سب لوگوں نے کہا کہ ایک شخص تم میں سے اُٹھے اور رکن یمانی کی طرف جائے اور اُسے پکڑ کر خدا سے دعا کرے۔ اپنی حاجت طلب کرے تو وہ ضرور پوری ہوگی اور پھر سب نے کہا کہ تم اے عبداللہ ابن زبیر اٹھو کہ تم ہجرت کے بعد سب سے پہلے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے شخص ہو۔ اس پر وہ اٹھے اور انہوں نے رکن یمانی کو پکڑ کر کہا:

"خداوندا! تو بزرگ ہے۔ ہر بڑی سے بڑی بات کے لئے تجھ ہی سے امید وابستہ کی جا سکتی ہے۔ میں تجھ ہی سے سوال کرتا ہوں تیرے عرش کی حرمت کے واسطے سے اور تیرے چہرے کی حرمت کے واسطے سے، اور تیرے پیغمبر کی حرمت کے واسطے سے کہ تو مجھے دنیا سے نہ اُٹھانا، یہاں تک کہ میں حجاز کا حکمراں ہوں اور مجھے خلیفہ کہہ کر سلام کیا جائے"۔

مذکورہ بالا توسل کے شواہد میں کچھ تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے متعلق ہیں۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زندگی میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے دعا میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بعد وفات نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ایک تو اصولاً جو شے شرک میں داخل ہو اس میں کسی کی حیات اور موت کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا اور پھر یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حقیقتاً وہ سی موت نہیں ہے جو عام اموات کی ہوتی ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس ظاہری موت کے بعد بھی حقیقتاً سنتے اور جواب دیتے

ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے مگر مجملاً اتنا عرض ہے کہ حیات شہداء نص قرآن ثابت ہے۔ اور پیغمبر خدا ﷺ کا مرتبہ پیش خدا حقیقتاً دوسرے شہداء سے بدرجہا بالاتر ہے اور ابودرداء کی روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ روزِ جمعہ مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو کہ اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور کوئی شخص مجھ پر بھی کبھی درود نہیں بھیجے گا مگر یہ کہ وہ اس کا درود میرے سامنے پیش ہوگا (راوی کہتا ہے) میں نے کہا کہ آپ کی وفات کے بعد بھی؟ فرمایا ہاں میری وفات کے بعد بھی۔ یقیناً اللہ نے زمین پر حرام کیا ہے کہ پیغمبروں کے جسم کو کھائے اور پیغمبر زندہ رہتا ہے۔ اُسے رزق عطا ہوتا ہے۔

حافظ ابن ماجہ نے اپنے سنن میں اس کی روایت کی ہے اور اس مضمون کی کئی حدیثیں ہیں جو خصائص کبریٰ سیوطی ہیں اور دلائل النبوۃ حافظ ابونعیم اصفہانی میں آئی ہیں۔ اور محدث سندی نے اپنے حاشیے میں جو سنن ابن ماجہ پر ہے، اس حدیث کے شرح میں لکھا ہے کہ اس میں شک نہیں ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ بات شہداء کے بارے میں تو قرآن میں آئی ہے تو پھر پیغمبروں کا کیا ذکر؟ اور خاص حیات انبیاء کے بارے میں بھی کچھ حدیثیں موجود ہیں، ان میں سے یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جناب موسیٰ کو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔

اب جبکہ حیاتِ رسول ﷺ ثابت ہوگئی تو آپ کی اس زندگی میں جو توسل کی حدیثیں ہیں، وہ سب اس وقت بھی توسل کے صحیح ہونے کی دلیل ہیں۔

قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ حضرت ﷺ کی زندگی میں اور نیز وفات کے بعد حضرت ﷺ سے توسل کے شواہد اتنے زیادہ ہیں کہ اُن کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

محدثین سلف حضرت ﷺ کی قبر مطہر پر جا کر دعا کو قابل اعتراض نہیں سمجھتے تھے چنانچہ علامہ شمس الدین جزری نے "حصن حصین" میں بہت اچھے الفاظ لکھے ہیں کہ:

"اگر پیغمبر خدا ﷺ کی قبر مطہر پر دعا قبول نہ ہو تو اور کہاں مقبول ہو

گی؟"۔

اور شاہ عبدالحق دہلوی نے اپنی کتاب "جذب القلوب" میں لکھا ہے کہ مقاصد کے حصول اور عجیب وغریب فائدوں کے مرتب ہونے میں جو واقعات سرورِ کائنات ﷺ کی قبر شریف پر فریاد اور طلب حاجت سے محتاجوں اور غریبوں کے سامنے آئے ہیں، بکثرت ہیں۔

قاضی عیاض نے شفاء میں امام مالک کا مکالمہ خلیفہ عباسی ابو جعفر منصور دوانیقی کے ساتھ درج کیا ہے کہ خلیفہ نے اُن سے پوچھا کہ میں قبلہ کی طرف رُخ کروں یا چہرۂ مبارک کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہوں؟ امام مالک نے کہا کہ آپ حضرت ﷺ کی طرف سے مُنھ کیونکر موڑیے گا جب کہ وہ آپ کے بھی وسیلہ ہیں اللہ کی طرف سے اور آپ کے باپ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کے بھی۔

ہمارے فاضل ہمعصر سید ابراہیم راوی رفاعی نے "اوراق بغدادیہ" میں رملی سے نقل کیا ہے، انہوں نے آدابِ زیارت میں لکھا ہے کہ پھر قبر شریف پر آئے حضرت ﷺ کے سر مبارک کی طرف رُخ اور قبلہ کی طرف پشت کئے ہوئے اور چار ہاتھ کے قریب کی دوری پر کھڑا ہو اور جدھر رُخ ہو، اُس کے نیچے کے حصے پر نظر رکھے اور سلام پیش کرے کیونکہ حدیث ہے کہ جو مجھے سلام کرے گا، میں اس کا جواب دوں گا۔ اور سلام میں آواز بلند نہ کرے جیسے حضرت ﷺ کی زندگی میں حکم تھا۔ پھر آخر میں حضرت کے چہرۂ مبارک کی طرف آکر حضرت ﷺ سے توسل کرے اور آپ سے پروردگار کی بارگاہ میں شفاعت کا خواہاں ہو۔

گزشتہ شواہد میں سے بعض سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت پیغمبر خدا ﷺ کی طرف نسبت رکھنے والی ہر چیز سے برکت حاصل کرنا صحابہ وتابعین اور سلف صالحین کے نزدیک مسلّم رہا ہے۔

عبداللہ بن عمر کی نسبت بیان ہے کہ وہ آثار پیغمبر خدا ﷺ کی جستجو میں پھرتے تھے اور جہاں حضرت ﷺ نے نماز پڑھی ہو، چاہے عمر میں ایک دفعہ، وہاں جا کر نماز پڑھتے تھے اور

اُنہی جگہوں پر پھر مسجدوں کی تعمیر ہوئی۔ اس کا سمہودی نے وفاء میں ذکر کیا ہے۔

ابن القیم نے اپنی کتاب "زاد المعاد" میں جناب اسماعیل اور ہاجرہ کے ذکر میں حتمی طور پر لکھا ہے کہ "ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے فرزند اسماعیل کا وطن سے دور ہونا اور تنہائی اور قربانی کے لئے آمادگی، اس سب کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے آثار اور ان کے قدموں کے نشانات محل عبادت بن گئے مومنین کے لئے اور مناسک حج میں داخل ہو گئے قیامت تک کے لئے"۔ اب جب جناب اسماعیل اور حاجرہ کے آثار اس وجہ سے کہ انہوں نے راہ خدا میں ایذائیں اُٹھائیں۔ اس کے مستحق ہوئے کہ وہ محل عبادت بن جائیں۔ تو جو ذات تمام انبیاء میں افضل ہو اور جس کا ارشاد ہو کہ کسی نبی کو وہ ایذائیں نہیں پہنچیں جو ایذائیں مجھے پہنچی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار کیا اس کے مستحق نہیں ہوں گے کہ اُن کی تعظیم و تکریم کی جائے؟ اور یہ کلیہ ہے کہ کسی بلند ذات کی طرف نسبت سے دوسری چیز میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ خصائص کبریٰ سیوطی میں معراج کے حال میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی ہے کہ:

> "میں چلا اور میرے ساتھ جبرئیل تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر انہوں نے کہا سواری سے اتریئے اور یہاں نماز پڑھیئے۔ میں نے ایسا کیا تو انہوں نے کہا آپ جانتے ہیں؟ آپ نے کہاں نماز پڑھی؟ یہ طیبہ ہے جہاں آپ ہجرت کر کے جائیں گے۔ اس کے بعد میں چلا تو پھر انہوں نے کہا اتریئے۔ یہاں نماز پڑھیئے۔ یہ طور سینا ہے جہاں اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا۔ پھر میں چلا، اور انہوں نے کہا اتریئے۔ نماز پڑھیئے۔ یہ بیت لحم ہے جہاں عیسیٰ پیدا ہوئے تھے"۔

اب ہر صاحب ضمیر فیصلہ کر سکتا ہے کہ عیسیٰ کی ولادت کا مقام اس لائق ہو کہ وہاں نماز پڑھی جائے تو کیا حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکان ولادت اس کا مستحق تھا کہ وہ منہدم کر دیا

جائے جیسا کہ وہابیوں نے کیا؟

اس کے علاوہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم وتکریم اور حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت رکھنے والی چیزوں کا احترام واکرام اور ان کو متبرک سمجھنا، اس کے بکثرت شواہد آثار صحابہ وسلف صالحین میں موجود ہیں۔

ابوعمرو شیبانی کی روایت ہے کہ میں ابن مسعود کے پاس ایک سال اُٹھتا بیٹھتا رہا، جس وقت وہ قال رسول اللہ کہتے تھے، ان کے جسم میں تھرتھری پڑ جاتی تھی۔

شیخ بدرالدین بن ابراہیم بن سعد اللہ ابن جماعہ کنانی متوفی ۷۳۳ھ کی کتاب "تذکرۃ السامع والمتکلم" (مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۵۳ھ) میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے جب حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہوتا تھا تو آپ کا چہرہ زرد ہو جاتا تھا۔

اسی کتاب میں امام مالک کے لئے لکھا ہے کہ جب حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُن کے سامنے ذکر ہوتا تھا تو ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا اور وہ جھک جاتے تھے۔

عبدالکریم سمعانی کی کتاب "ادب الاملاء والاستملاء" (مطبوعہ بریل ۱۹۵۳ء) میں یحییٰ بن بکیر سے روایت ہے جب موطا (مجموعۂ احادیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حدیثوں کا پڑھ پڑھ کر مالک مقابلہ کراتے تھے تو پورا لباس عمامے کے ساتھ پہنتے تھے اور سر جھکائے رہتے تھے اور جب تک ان احادیث کو لکھوا کر فارغ نہیں ہوتے تھے سر وغیرہ کو کھجاتے بھی نہیں تھے، نہ ناک چھنکتے تھے۔ یہ کیفیت اُن کی ارشاداتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم وتکریم کے لحاظ سے ہوتی تھی۔

اسی کتاب میں معن بن عیسیٰ وزاق کا بیان ہے کہ مالک جب احادیث بیان کرنے بیٹھتے تھے تو غسل کرتے تھے اور خوشبو لگاتے تھے۔ حاضرین مجلس میں سے کوئی آواز بلند کرتا تھا تو خفا ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ خالق نے ارشاد فرمایا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر آواز بلند نہ کرو۔ آج رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بیان ہوتے وقت کوئی آواز بلند کرے تو وہ ایسا ہوگا جیسے کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر آواز بلند کی۔

علاوہ دوسرے حضرات کے نواب صدیق حسن خان قنوجی نے بھی لکھا ہے کہ:

"امام مالک مدینے میں پیادہ چلتے تھے کہ شاید ان کے جسم سے خاک کا کوئی وہ جزو متصل ہو جائے جس پر رسول خدا ﷺ راستہ چلتے ہیں اور حضرت ﷺ کی تعظیم کے سبب وہ مدینے میں سوار ہو کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں سواری پر چلوں اس خاک کے اوپر جہاں رسول اللہ ﷺ دفن ہیں۔

تعظیم کی ایک قسم یعنی بوسہ لینا۔ اس کے خلاف وہابی مسلک کے حضرات بہت تشدد سے کام لیتے ہیں۔ مگر اس کے لئے خود حضرت پیغمبر خدا ﷺ کا رضامندانہ سکوت ہی نہیں بلکہ صریح اجازت بھی موجود ہے اور آپ کے بعد سلف صالحین کا عمل بھی جاری ہے۔ چنانچہ "ادب الاملاء والاستملاء" میں عبدالرحمن بن کعب بن مالک کی روایت ہے اپنے والد سے کہ میں حضرت کی خدمت میں آیا تو حضرت ﷺ کے ہاتھوں اور دونوں گھٹنوں کا بوسہ لیا اور شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب "محاضرۃ الابرار" میں ابن یزید کی روایت ہے اپنے والد سے کہ ایک اعرابی رسول ﷺ کے پاس آیا اور ایک معجزے کی خواہش کی۔ اس معجزے کے دیکھنے کے بعد کہا یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ ﷺ کے ہاتھوں اور پیروں کا بوسہ لوں۔ آپ ﷺ نے اس کی اجازت دے دی۔ پھر اس نے کہا کہ اب مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کو سجدہ کرلوں۔ حضرت ﷺ نے فرمایا نہیں۔ کسی کو کسی کا سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔

بوسہ بنظر تعظیم بھی ہوتا ہے اور بنظر محبت بھی۔ بہر حال اس کو شرک کہنا یا ممنوع قرار دینا، دونوں غلط ہیں۔

اصابہ حافظ ابن حجر میں ہے کہ خود حضرت پیغمبر خدا ﷺ نے عثمان بن مظعون رضوان اللہ علیہ کی لاش کا بوسہ لیا اور اس وقت آپ ﷺ کی آنکھیں گریاں تھیں۔

بعد وفات پیغمبر خدا ﷺ حجرۂ نبویہ اور روضہ مقدسہ اور دوسرے منسوبات کو بھی بوسہ

لینے پر مسلمانوں کا عمل رہا اور علماء اس سے متفق رہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کے ایک مصاحب خاص ابراہیم حربی کے لیے شیخ منصور حنبلی نے حاشیہ اقناع میں لکھا ہے کہ انہوں نے کہا "حجرۂ نبی ﷺ کا بوسہ لینا مستحب ہے"۔

مہدی عباسی کے پاس ایک شخص نعلین لایا۔ اس ادّعا کے ساتھ کہ یہ رسول خدا ﷺ کے پائے مبارک تک پہنچی ہے اور حضرت ﷺ کی پہنی ہوئی ہے، تو باوجودیکہ خود بعد میں کہا مجھے یقین ہے کہ یہ شخص غلط کہتا ہے۔ رسول ﷺ کے پائے مبارک سے یہ نعل چھو بھی نہیں گئی ہے، پھر بھی اس لئے کھڑے ہو کر بوسہ لیا، آنکھوں سے لگایا کہ عام مسلمان مجھ پر بے ادبی کا الزام لگائیں گے کہ میرے پاس رسول خدا ﷺ کی نعلین لائی گئی اور میں نے اس کی تعظیم و تکریم نہیں کی۔ یہ واقعہ شیخ ابن عربی نے "محاضرۃ الابرار" میں درج کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ منسوبات پیغمبر خدا ﷺ کی تعظیم جمہور ملت اسلامیہ کے دل و دماغ میں مرتکز تھی۔

تعظیم و تکریم اور تحصیل برکت ہی کی ایک صورت مس کرنا بھی ہے، خواہ اپنے ہاتھ کو رسول ﷺ کے جسم مبارک تک پہنچا کر یا آپ ﷺ سے خواہش کرنا کہ آپ ﷺ اس پر ہاتھ پھیر دیجئے۔ ان دونوں باتوں کا وقوع رسول اللہ ﷺ کی اجازت اور خود آپ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ میں لکھا ہے کہ بنی بکار کا وفد حضرت پیغمبر خدا ﷺ کی خدمت میں آیا۔ ان میں معاویہ بن ثور بن عبادہ بحیثیت سردار کے تھے۔ جن کی ایک سو برس کی عمر تھی۔ یہ سب مسلمان ہوئے اور رخصت ہوتے وقت معاویہ نے حضرت ﷺ سے خواہش ظاہر کی کہ میں آپ ﷺ کے جسم مبارک کو اپنے ہاتھ سے مس کر کے برکت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت ﷺ نے اس کی اجازت دی۔ پھر انہوں نے کہا میرا بیٹا بشر بڑا سعادت مند

ہے۔اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر دیجئے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر دیا۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موہائے مبارک کی تقسیم کے صحاح اہل سنت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہوئی تھی۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طلحہ انصاری سے جنہوں نے سر مبارک سے بالوں کو صاف کیا تھا، فرمایا کہ انہیں لوگوں میں تقسیم کرو۔

"محاضرۃ الاوائل" میں ہے کہ ان بالوں کو ابو طلحہ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تقسیم کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے موہائے مبارک اس لئے تقسیم کئے گئے کہ وہ صحابہ کے پاس برکت کے لئے باقی رہیں۔

"جمع بین الصحیحین" میں عبداللہ بن موہب کی روایت ہے کہ میرے گھر والوں نے مجھے زوجۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جناب ام سلمہؓ کے پاس پانی کے ایک پیالے کے ساتھ بھیجا۔ وہ چاندی کا ایک ظرف لائیں جس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ موہائے شریف تھے۔ اُن میں سے کچھ بال انہوں نے اس پیالے میں ڈال دیئے۔ اور جب کوئی بیمار ہوتا تھا تو وہ اسی ظرف سے نکال کر کچھ بال ڈال دیتی تھیں۔ اور وہ بیمار اس پانی کو پیتا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے جھک کر اس برتن میں دیکھا تو کچھ سرخ رنگ کے بال تھے۔

قاضی عیاض نے شفاء میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات و برکات میں لکھا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موہائے مبارک میں سے چند بال خالد بن ولید کی ٹوپی میں تھے جن کی وجہ سے وہ ہر جنگ میں فتح پاتے تھے۔

بخاری کی روایت ابن سیرین سے ہے کہ انہوں نے عبیدہ سے کہا کہ ہمارے پاس کچھ موہائے مبارک ہیں جو ہمیں انس یا اُن کے گھر والوں سے ملے ہیں۔ انہوں نے کہا ارے اُن میں سے ایک بال میرے پاس ہو تو وہ میرے لئے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

اسی طرح جو شے ذرا بھی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھتی ہو، اُسے ہمیشہ متبرک و مقدس

سمجھا گیا چنانچہ شفائے قاضی عیاض میں ہے کہ عبداللہ بن عمر منبر رسول ﷺ کے اُس محل پر جہاں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہوتے تھے، ہاتھ رکھتے تھے اور اُسے تبرکاً اپنے منہ پر ملتے تھے۔

اصابہ حافظ ابن حجر میں ہے کہ یزید ابن اسود کے جب احتضار کا وقت تھا تو صحابی رسول ﷺ واثلہ بن اسقع اُن کے پاس آئے تو انہوں نے ان کا ہاتھ لے کر اپنے منہ پر ملا اور سینے پر رکھا اور کہا کہ یہ وہ ہاتھ ہے جو رسول ﷺ کے دست مبارک سے مس ہوا ہے۔

مسند احمد میں ام سلیم سے روایت ہے کہ حضرت ﷺ نے ایک مشک سے جو اُن کے یہاں تھی پانی نوش فرمایا تھا تو اس مشک کا دہانہ جو حضرت ﷺ کے دہن مبارک سے مس ہوا تھا جدا کر کے حصول برکت کے لئے رکھ لیا گیا، اور ایسا ہی واقعہ ابن ماجہ اور ترمذی نے کبشہ انصاریہ کے متعلق درج کیا ہے اور ترمذی نے حسن صحیح لکھا ہے۔

"جمع بین الصحیحین" میں سہل بن سعد صحابی کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے پیغمبر خدا ﷺ سے ایک چادر آپ کی مانگ کر حاصل کی اور جب لوگوں نے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے اسے اس لئے حاصل کیا ہے کہ وہ میرا کفن ہو اور اس طرح میں عذاب قبر سے محفوظ رہوں۔

شفائے قاضی عیاض میں ہے کہ صحابہ پیغمبر ﷺ خدا آپ کے آثار مبارک کو آپ ﷺ کے بعد بڑی بڑی قیمتوں میں حاصل کرتے تھے۔

سردست اتنے شواہد پیش کر دیئے گئے ہیں جو اثبات مطلب کے لئے کافی و وافی ہیں۔

باوجودیکہ وہابی حضرات اپنے کو اہل سنت میں داخل کرتے ہیں اور ان کے ہم خیال جو ہندوستان میں ہیں، وہ اکثر اپنے کو "اہل حدیث" کہتے ہیں مگر ان کا مسلک جو پیغمبر خدا ﷺ سے توسل کی مخالفت اور آپ ﷺ کے آثار و منسوبات کی تعظیم و تکریم کے خلاف ہے سنت کے بھی خلاف اور حدیث کی رو سے بھی غلط ہے۔

تیسرا باب

وہابی عقیدہ اولیاء وصالحین کے بارے میں

ابن عبدالوہاب کو اُن کی بزرگی اور کسی امتیاز سے شدت کے ساتھ انکار ہے، اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ ان میں سے کسی سے بھی توسّل اور خالق کی بارگاہ میں شفاعت کی درخواست انہیں خدا سمجھ لینا ہے اور عبادت میں اُس کے ساتھ دوسرے کو شریک کرنا ہے۔ اُسے انہوں نے اور اُن کے تابعین نے بڑے طول طویل بیانات کے ساتھ تحریر کیا ہے جس میں سے بعض عبارتوں کا مضمون اُن کے نقطۂ نظر کے پورے طور سے نمایاں کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ پھر اُن کے مندرجات کو ایک ایک کر کے باطل کیا جائے گا۔

خود ابن عبدالوہاب نے اپنی کتاب ''التوحید'' میں اُن آیات قرآن کے درج کرنے کے بعد جو توحید کے بارے میں اور دوسرے خداؤں کی عبادت کرنے والے مشرکین کی رد میں لکھا ہے:

> ''یہ شرک جو ان آیتوں میں اور ایسی ہی دوسری آیتوں میں مقصود ہے، اس میں داخل ہے قبروں کے پوجنے والوں اور انبیاء اور ملائکہ اور نیک بندگان الٰہی کی عبادت کرنے والوں کا شرک، یہی عرب کے اہل جاہلیت کا شرک تھا جس کے ختم کرنے کے لئے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت ہوئی تھی کہ وہ اُن سے دعائیں مانگتے تھے اور ان کی طرف پناہ لیتے تھے اور اُن سے سوال

کرتے تھے، خدا کے یہاں ان کے تقرب کو اپنا وسیلہ قرار دیتے تھے جیسا
کہ قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں اس کا ذکر ہے۔ حالانکہ وہ انہیں آسمان،
زمین یا کسی ایک ذرّے کا بھی کائنات میں سے خالق نہیں سمجھتے تھے۔ مگر
چونکہ ان کی عبادت کرتے تھے لہٰذا وہ مشرک قرار پائے تو اسی طرح یہ لوگ جو
اولیاء و صالحین کا واسطہ دیتے ہیں اور اُن سے دعائیں مانگتے ہیں"۔

اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ زیارت قبور کرنے والوں اور اولیاء و مقربین کی تعظیم و تکریم کرنے والوں کی، اُن کی عبادت کرنے والوں کی لفظ سے تعبیر کی گئی ہے۔ اس کے لئے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ عبادت کے کیا معنی ہیں؟

''عبادت'' درحقیقت کسی خاص کام کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ کام ہے جو کسی کو خدا سمجھنے کی نیت سے اور اس نیت کے تقاضے سے کیا جائے۔ اسی لئے اولاد کا اپنے ماں باپ کے سامنے جھکنا، اور جاہل کا عالم کے سامنے جھکنا۔ ایک اُمتی کا سادات کے سامنے جھکنا، کسی بھی چھوٹے کا اپنے بڑے کے سامنے جھکنا عبادت نہیں ہے۔ لیکن مجوسیوں کا آگ کے سامنے جھکنا اور بت پرستوں کا بتوں کے سامنے جھکنا عبادت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرک کسی کام کی نوعیت سے وابستہ نہیں بلکہ اعتقاد الوہیت سے وابستہ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی کو سجدہ کیا جائے مگر وہ عبادت اس کی قرار نہ پائے اور ہو سکتا ہے کہ صرف آنکھ کا اشارہ ہو اور وہ عبادت کا مصداق ہو۔

مشرکین چونکہ اپنے بتوں کو خدا سمجھتے تھے لہٰذا کہتے تھے کہ ہم ان کی عبادت کرتے ہیں۔ (ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی) لیکن مسلمان قبر رسول ﷺ یا کسی مقرب الٰہی کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، اب سے پوچھا جائے تو وہ کہیں گے کہ ہم ان کی عبادت نہیں کرتے۔ عبادت اللہ کی کرتے ہیں۔ ہاں ہم ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ یہیں سے اُن مسلمانوں میں اور اُن مشرکین میں فرق ظاہر ہے۔

اس طرح کی تعظیم وتکریم شرک نہیں ہو سکتی جب کہ والدین کے لیے خالق نے خود حکم دیا کہ: ''ان کے سامنے اپنے کو تذلل و عاجزی کے ساتھ جھکائے رہا کرو'' ۔ یہ تعظیم کا حکم نہیں تو اور کیا ہے؟

اور ارشاد فرمایا کہ:

''جو شعائر الہیہ کی تعظیم کرے تو یہ تقویٰ و پرہیزگاری کا ایک جزو ہے''

اور اس طرح اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کے لیے فرمایا اور حضرت پیغمبر خدا ﷺ کو حکم دیا کہ:

''اپنے بازو جھکایئے اس کے لیے جو مومنین میں سے آپ کا پیرو متبع ہے'' ۔

سب سے بالاتر یہ کہ حق تعالی نے ملائکہ مقربین کو حکم دیا کہ وہ ابو البشر جناب آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں اور ابلیس کو سجدہ نہ کرنے پر مطرود و مردود قرار دیا اور سورۂ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور چاند و سورج انہیں سجدہ کر رہے ہیں اور پھر اُس کی تعبیر یوں وقوع میں آئی کہ انہوں نے اپنے باپ کو جو نبی خدا حضرت یعقوب تھے اور اپنی والدہ کو بلند تخت پر بٹھایا تو ان دونوں نے اور تمام بھائیوں نے جو گیارہ تھے، انہیں سجدہ کیا۔

شریعت اسلام میں اللہ کے سوا کسی کے لیے سجدے کا روا نہ ہونا ایک حکم شرعی ہے۔ لیکن سابق شریعتوں میں اس کا جائز ہونا اور وقوع میں آنا اس کی تو دلیل قطعی ہے کہ وہ شرک نہیں ہے کیونکہ اصول دین میں تمام انبیاء متحد ہیں۔ جو شے داخل شرک ہو، وہ کسی بھی شریعت میں جائز نہیں ہو سکتی۔

اس سب سے یہ امر پایۂ ثبوت تک قطعی طور پر پہنچ جاتا ہے کہ ہر تعظیم عبادت نہیں ہے۔ عبادت کی بنیاد خدا سمجھنے پر ہے۔ اور جو مسلمان انبیاء و اولیاء و مقربین کی تعظیم کرتے ہیں، اُن کے ذہن میں ہرگز اُن کے خدا ہونے کا تصور نہیں ہوتا بلکہ وہ یقینی طور پر صدق دل سے جانتے ہیں کہ یہ اللہ کے بندے ہیں جنہوں نے اپنی پوری عمر اُس کی عبادت اور اطاعت میں صرف کی ہے اور اُس کی راہ میں انہوں نے قربانیاں دی ہیں، اسی لئے وہ ہماری تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں تو یہ تعظیم

درحقیقت اللہ کی تعظیم ہے جوعین توحید ہے اور یہ تعظیم غیر اللہ کی جو اللہ کی طرف نسبت خاص کے پیش نظر ہے تعظیم ان افراد کی ہے لیکن وہ عبادت ان کی نہیں ہے بلکہ اُس کی عبادت ہے جس کی طرف انتساب سے ان کی تعظیم ہورہی ہے۔

اور دعا، وہ براہ راست ان سے نہیں ہوتی کہ ہم انہیں اپنی حاجت براری کے لئے خدا سے بے نیاز ہو کر کافی سمجھتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ بارگاہ الٰہی میں اُس کی اطاعت و عبادت کی وجہ سے قرب حاصل کئے ہوئے ہیں، ہمارے لئے اُس کی بارگاہ میں حاجت براری کے لئے دعا کریں اور یہ عام مومنین کے لئے آپس میں وارد ہے کہ ایک کی دعا دوسرے کے بارے میں بسا اوقات مستجاب ہوتی ہے،اور چونکہ ہم انہیں زندہ سمجھتے ہیں جیسا کہ شہداء کے بارے میں صراحۃً قرآن میں ہے تو ہم اُن سے مخاطب ہو کر بھی مدد کے لئے جو کہتے ہیں، اس کا بھی مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ہمارے لئے عرض معروض کریں یا مرضیٔ باری کے ماتحت اس کے اذن سے خود مدد کر دیں اور اس طرح اللہ کے فعل کی نسبت غیر اللہ کی طرف قرآن مجید سے ثابت ہے جیسے وفات کا دینا اللہ کا کام ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ نفوس کو وفات دیتا ہے اُن کی موت کے وقت اور دوسری جگہ اس کی نسبت ملک الموت کی طرف ہے۔ ارشاد ہوا ہے: کہیئے کہ تمہیں وفات دیتا ہے موت کا فرشتہ اور تیسری جگہ اُس کی نسبت ان فرشتوں کی طرف دی گئی ہے جو ملک الموت کے ماتحت ہیں، ارشاد ہوا کہ وہ جنہیں فرشتے وفات دیتے ہیں درانحالیکہ وہ اپنے نفوس پر ستم ڈھانے والے ہیں، اسی طرح عطائے رزق یا اولاد کی نسبت کسی کی طرف ہو تو اُس میں کوئی حرج نہیں، جبکہ کہنے والا عقیدہ یہی رکھتا ہو کہ اصل عطا کرنے والا خداوند عالم ہے اور اگر یہ عطا کریں گے تو اُس کے حکم سے یا خود اُس کی بارگاہ میں سفارش کے ذریعے سے۔

سنن ابوداؤد میں جبیر بن مطعم کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نے حضرت ﷺ کے پاس آ کر قحط سالی کا حال بیان کیا اور مقصود اس کا یہ تھا کہ حضرت ﷺ طلب باراں فرمائیں مگر

اُس نے یہ کہا کہ: ہم اللہ سے سفارش کراتے ہیں آپ کے یہاں اور آپ کی شفاعت چاہتے ہیں اللہ کی بارگاہ میں۔ پہلے جملے پر حضرت ﷺ نے کئی دفعہ تسبیح الٰہی فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اُس کی ذات برتر ہے اس سے کہ اُس کو کسی کے پاس شفاعت کے لئے پیش کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے اس فقرے پر کہ آپ بارگاہِ الٰہی میں سفارش کیجئے کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔

ہاں جو شخص ان حضرات کو اللہ کا (معاذ اللہ) برابر دار سمجھے اور اللہ کے مقابلے میں انہیں حاجت روا اور کارساز مانے اُسے ہم بھی مشرک سمجھتے ہیں۔

ابن عبدالوہاب کا قول ہے کہ:

''جو کچھ مسلمانوں کا اولیاء و صالحین کے ساتھ عمل ہے یہی بس مشرکین عرب کا عمل تھا''۔

یہ از روئے قرآن درست نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ وہ اپنے اصنام کو ''آلہہ'' کہتے تھے یعنی خدا سمجھتے تھے اور اس لئے وہ خدا کی عبادت سے اپنے کو بے نیاز سمجھتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ ''انہوں نے پیغمبر ﷺ کے لئے کہا کہ یہ ہمیں ہمارے خداؤں سے گمراہ کئے دیتا ہے''۔

سورۂ صافات میں ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ''کیا ہم ایک دیوانے شاعر کی خاطر اپنے خداؤں کو چھوڑ دیں؟''۔

سورۂ ص میں ہے کہ اُن کی زبانی رسول ﷺ کے لئے کہ ''اس نے بہت سے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا۔ یہ عجیب بات ہے''۔

سورۂ شعراء میں ہے اہلِ دوزخ کی زبانی کہ ''وہ اپنے معبودوں سے کہیں گے کہ ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے کہ تمہیں پروردگار عالمیان کے برابر قرار دیتے تھے''۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ کے برابر قرار دیتے تھے۔

سورۂ احقاف میں ہے کہ انہوں نے کہا" تم آئے ہو کہ ہمیں ہمارے خداؤں سے ہٹاؤ"۔

سورۂ نوح میں ہے کہ" وہ مشرکین کہتے ہیں کہ اپنے خداؤں کو کبھی نہ چھوڑنا، ودکو، سواع کو، یغوث اور یعوق اور نسرکو" (یہ سب اُن کے بتوں کے نام ہیں جنہیں وہ صاف صاف خدا کہہ رہے ہیں)۔

سورۂ ہود میں ہے کہ" ہم ہرگز ان خداؤں کو نہیں چھوڑیں گے"۔

پھر ہے کہ" ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے خداؤں میں سے کسی نے تمہیں کچھ نقصان پہنچا دیا ہے"۔............اور خود خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"نہیں فائدہ پہنچایا انہیں اُن کے خداؤں نے جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے تھے کچھ بھی"۔

اور سورۂ حجر میں ہے کہ" ہم نے آپ کو بچایا اُن مذاق اڑانے والوں سے جو اللہ کے سوا دوسرا خدا بناتے ہیں"۔

اور سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ" اگر اُس کے ساتھ اور خدا ہوتے جیسا کہ وہ کہتے ہیں تو اس وقت وہ عرش کے مالک کے مقابلے میں کوئی صورت نکال لیتے"۔

اور سورۂ مریم میں ارشاد ہوا ہے کہ" ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے خدا بنا لئے ہیں تا کہ وہ اُن کے لئے باعثِ غلبہ ہوں، ہرگز نہیں، بہت جلد وہ اُن کی عبادت سے انکار کریں گے اور خود اُن کے فریق مخالف ہوں گے"۔

اور سورۂ انبیاء میں ان کی زبانی ارشاد ہوا ہے کہ" کیا یہی وہ شخص ہے جو تمہارے خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے"؟۔

پھر ہے جب حضرت ابراہیم ؑ نے بتوں کو توڑ ڈالا:

" انہوں نے کہا کہ کس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کیا؟ یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے"۔

پھر ہے:

''انہوں نے (ابراہیم علیہ السلام سے) کہا کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے اے ابراہیم؟''۔

پھر ارشاد ہوا ہے:

''انہوں نے کہا کہ انہیں آگ میں ڈال دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو''۔

اور سورۂ فرقان میں ہے:

''انہوں نے اُسے چھوڑ کر ایسے خدا بنائے ہیں جو کسی چیز کو خلق نہیں کر سکتے اور وہ خود خلق کئے گئے ہیں''۔

اس سب سے ظاہر ہے کہ وہ مشرکین اپنے بتوں کو بلا تکلف الہہ یعنی خداؤں کی لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔ اس کے برخلاف کسی مسلمان سے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا اولیاء و مقربین میں سے کسی کی تعظیم کرتا ہے پوچھا جائے کہ تم انہیں خدا سمجھتے ہو اور ان کی عبادت کرتے ہو؟ تو وہ ہرگز اس کا اقرار نہ کرے گا بلکہ شدت کے ساتھ انکار کرے گا۔ اسی سے اُن مشرکین اور اُن مسلمانوں میں فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کے لئے یہ کہنا کہ ''اُن کا روزہ نماز وغیرہ سب عوام کو دھوکا دینے کے لئے ہے اور اپنے شرک کو اسلام کے دامن میں چھپانا ہے، اس کے مقابلے میں کوئی شخص اتنے ہی بلند آہنگ کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ نجدی وہابیوں کا نماز، روزہ اور حج وغیرہ سب نمائشی ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے جبکہ وہ اُس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کے منکر ہیں جن کی بدولت ان کو یہ سب باتیں یاد ہوئی ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس طرح ایک دوسرے کو کہنا کوئی علمی بحث کا انداز نہیں رکھتا، اس لئے اس پر زیادہ لکھنا تضیع اوقات ہے۔

٩

چوتھا باب

وہابی عقیدہ تمام اطرافِ عالم کے مسلمانوں کے بارے میں

وہابی لوگ اپنے سوا تمام دنیا کے مسلمانوں کو کافر و مشرک سمجھتے ہیں۔ آلوسی نے "تاریخ مجد" میں ایک اہم وہابی عالم شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمن ابن محمد بن عبدالوہاب نجدی کی ایک طول طویل عبارت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلمانانِ عالم پر اُن کے کیا الزامات ہیں جن میں سے بہت سی باتیں جھوٹ ہیں اور بعض سچ ہیں مگر ان کو غلط کہنا غلط ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ اللہ سے محبت کے بجائے غیر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ حالانکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا دیگر اولیا و مقربین سے جو لوگ محبت کرتے ہیں وہ اللہ کے مقابلے میں محبت نہیں ہے بلکہ اللہ کی خاطر ہے یا اس لئے کہ انہوں نے اُس کے دین کی خاطر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اُس کی راہ میں قربانیاں پیش کی ہیں۔ ایسی محبت ایک فریضۂ دینی کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ذوی القربیٰ کی محبت کو آیۂ مودّت میں اجرِ رسالت کہہ کے طلب کیا گیا ہے تو جس نے اس محبت سے انحراف کیا، اس نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق ادا نہیں کیا اور ایک جگہ ارشاد ہوا کہ وہ جو ایمان اور عمل صالح رکھتے ہیں، اُن کے لئے اللہ ایک محبت قرار دیتا ہے یعنی اس محبت کو فرض قرار دیتا ہے اور حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی زبانی ہے کہ:

''پروردگارا! میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو تیرے گھر کے پاس رکھا ہے۔ پروردگارا! اس لئے کہ وہ نماز قائم رکھیں تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا دے کہ وہ ان سے محبت کریں''۔

اور سورۂ برأت میں ہے کہ:

''اگر تمہارے باپ دادا، اولاد.......... وغیرہ وغیرہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ تمہیں محبوب ہوں تو عذاب کے منتظر رہو''۔

یہاں خدا کے ساتھ مقامِ محبت میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لیا ہے:

''انس کی روایت ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُسے اُس کے باپ بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں''۔

اس کی بخاری اور مسلم دونوں نے تخریج کی ہے اور سنن ابن ماجہ میں عباس بن عبد المطلب سے روایت ہے کہ:

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بخدا کسی کے دل میں ایمان داخل نہیں ہو سکتا جب تک میرے اہل بیت علیہم السلام سے محبت نہ کرے اللہ کی خاطر اور میری قرابت کے لحاظ سے اور حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے لئے روزِ خیبر فرمایا کہ میں کل اُسے علم دوں گا جس سے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبت رکھتے ہیں اور وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت رکھتا ہے''۔

اسے بھی بخاری و مسلم دونوں نے درج کیا ہے۔ نیز خود حضرت علی علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمایا:

''اے علی علیہ السلام! تمہاری محبت ایمان اور تم سے بُغض کفر و نفاق ہے''۔

اور ایسی ہی بکثرت حدیثیں ہیں۔

اب یہ لوگ جو محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ کو اسبابِ شرک میں داخل کر رہے ہیں، تو بدیہی طور پر ظاہر ہے کہ ان کے دلوں میں ذرہ بھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں ہے جس کے بعد بغض رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کی دولت سے محروم ہونا ظاہر ہے۔ لیکن جو واقعی صاحب ایمان ہیں، وہ ان کی محبت کو پروردگار عالم کی طرف سے ایک فریضہ سمجھتے ہیں۔

اور ابن عبدالوہاب کی کتاب التوحید کے شارح کا یہ کہنا کہ یہ ان سے اللہ سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور یہ ان کی راہ میں اتنا خرچ کرتے ہیں جس کا عشر عشیر بھی اللہ کے لئے صرف نہیں کرتے، بالکل غلط ہے بلکہ یہ ان سے محبت اللہ کی محبت کے سبب سے کرتے ہیں اور جو کچھ ان کے نام پر خرچ کرتے ہیں وہ بھی اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ یہ لوگ اموات کے قبور کی زیارت اور اُن کی طرف سے خیر خیرات اور توسّل کی بناء پر مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں اور ان کے بہت بڑے امام فخر الدین رازی ان چیزوں کو اُن باتوں میں قرار دیتے ہیں جن پر تمام مذاہب عالم کے افراد متفق ہیں۔ اور جو عام فطرتِ انسانی کا تقاضا ہیں چنانچہ وہ تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت میں کہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، بقائے روح کے دلائل کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"دسویں دلیل یہ ہے کہ ہند اور روم اور عرب و عجم تمام دنیا کے اہل مذاہب، یہودی ہوں یا نصرانی یا مجوسی یا مسلمان سب اپنے اموات کی طرف سے خیر خیرات کرتے ہیں، اُن کے لئے دُعائے خیر کرتے ہیں اور اُن کی قبروں کی زیارت کو جاتے ہیں۔ اگر یہ سب یہ نہ سمجھتے ہوتے کہ مرنے کے بعد بھی وہ کسی نہ کسی طرح کی زندگی رکھتے ہیں تو اُن کا یہ فعل عبث ہوتا۔ ان سب کا متفق ہونا اس خیر خیرات پر اس کی دلیل ہے کہ یہ فطری طور پر بلا

اختلاف یہ مانتے ہیں کہ اصل انسان اس جسم کے علاوہ کوئی جزء ہے اور وہ جزء اس جسم کے مردہ ہونے کے ساتھ مردہ نہیں ہو گیا''۔

احادیث پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ:

''بڑا حسن عمل یہ ہے کہ اپنی نمازوں کے ساتھ اپنے ماں باپ کے لئے نمازیں پڑھو اور اپنے روزوں کے ساتھ اپنے ماں باپ کے لئے روزے رکھو''۔

اس حدیث کے متعلق ابراہیم بن عیسیٰ طالقانی نے عبداللہ بن مبارک سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ اس حدیث کی سند میں تو نقص ہے مگر اموات کی طرف سے تصدق میں اختلاف کوئی نہیں ہے۔

''محاضرۃ الابرار'' ابن عربی میں دو جگہ جلد اول و جلد دوم میں انس بن مالک کی روایت یہ ہے کہ:

''کسی میت کی طرف سے جو خیرات کی جاتی ہے، اُسے نعم الٰہی کی صورت میں فرشتے لے کر اس کی قبر کے پاس جاتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں'' یہ تیرے لئے بھیجا گیا ہے''۔

وہابی تصور کہ یہ لوگ خدا سمجھ کر محبت کرتے ہیں اور جھکتے ہیں اور امید وابستہ کرتے ہیں۔ اس میں پہلا جزء کہ وہ خدا سمجھتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ ہاں محبت کرتے ہیں جس کے متعلق تشریح ہو چکی اور یہ کہ وہ جھکتے ہیں، درست ہے لیکن یہ خداوندی نسبت کے پیش نظر رکھنے کی وجہ سے جھکنا، حقیقتاً اللہ کے لئے جھکنا، نہ کہ ذاتاً ان اشخاص اور ان چیزوں کے لئے اور امید اللہ سے ہے، ان کے وسیلے سے، نہ کہ ذاتاً اُن سے۔

خوف و رجاء یعنی ڈر اور اُمید کے بارے میں امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کی تشریح کتاب ''العالم والمتعلم'' میں ہے: متعلم کا سوال ہے کہ جو کسی سے خوف کرے یا امید

وابستہ رکھے تو کیا وہ کافر ہے؟ اس کا جواب جو عالم نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ:

"رجاء اور خوف یعنی امید اور ڈر کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کوئی شخص کسی سے امید کرے یا اس سے ڈرے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ خود اللہ کو چھوڑ کر کسی ضرر رسانی یا نفع رسانی پر قدرت رکھتا ہے تو یہ شخص کافر ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے اُمید رکھتا ہو یا کسی سے ڈر رہا ہو خیر کی اُمید یا آزمائش کے خوف کی وجہ سے اللہ کی طرف سے کہ شاید اللہ اسے کے ذریعے سے مجھ تک خیر پہنچائے، یا اس کے ہاتھوں مجھ پر کوئی مصیبت نازل کرے یا کسی نعمت کو سلب کرے تو ایسا شخص کافر نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ باپ بھی بیٹے سے اُمید رکھتا ہے کہ وہ اُسے فائدہ پہنچائے گا اور کوئی شخص اپنی سواری کے جانور سے اُمید رکھتا ہے کہ وہ اسے منزل تک پہنچائے گا اور اپنے ہمسائے سے امید رکھتا ہے کہ وہ اُسے فائدہ پہنچائے گا اور بادشاہ سے اُمید رکھتا ہے کہ وہ اس کی دادرسی کرے گا اور ان باتوں سے کفر لازم نہیں آتا اس لئے کہ اس کے ذہن میں یہ ہے کہ اصل مرکز نفع و ضرر اللہ ہے مگر وہ شاید اس بیٹے کے ذریعے سے میری مدد کرادے یا اس بادشاہ کے ہاتھ سے میری دادرسی کرادے، اس لئے ایسا شخص کافر نہیں ہے۔ اسی طرح خوف۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کی زبانی ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ لوگ مجھے قتل نہ کریں، معلوم ہوا کہ اسباب ظاہری کی بناء پر کسی سے خوف بھی باعث کفر نہیں ہے"۔

یہ کہنا کہ یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسروں سے دعا مانگتے ہیں تو یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ دوسروں سے ذاتاً دُعا نہیں مانگتے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ان کے لئے دعا

کریں یا وہ اجازت دے تو اس کی دی ہوئی طاقت سے خود اس کی مدد کریں، اس کے علاوہ ان کے وسیلے سے خداوند عالم کی بارگاہ میں دعا مانگتے ہیں اور توسل کے شواہد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں وہابی عقیدے کے باب میں درج ہو چکے ہیں۔ کچھ مزید شواہد یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ:

''حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنے گھر سے نماز کے لئے نکلے یہ کہے: خداوندا! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ان افراد کے حق کا واسطہ دے کر جو تیری بارگاہ کے سائل ہیں اور تجھ سے سوال کرتا ہوں اپنے اس راستہ طے کرنے کے حق سے جو تیری طرف ہے اس لئے کہ میں نہ کسی نفسانیت کی وجہ سے نکلا ہوں، نہ شر اور فساد کے لئے۔ نہ دکھانے اور سنانے کے لئے۔ میں نکلا ہوں صرف تیری ناراضگی سے بچنے اور تیری خوشنودی کی طلب میں تو میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے آتش دوزخ سے پناہ میں رکھ اور میرے گناہوں کو معاف فرما کہ سوا تیرے کوئی نہیں جو گناہوں کو معاف کرے''۔

اسے حافظ جلال الدین سیوطی نے جامع کبیر میں بھی درج کیا ہے۔

اور حافظ ابونعیم نے ''عمل الیوم واللیلۃ'' میں ابو سعید خدری سے روایت درج کی ہے کہ:

''حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز کے لئے برآمد ہوتے تھے تو کہتے تھے کہ خداوندا! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تجھ سے سوال کرنے والے کے حق کا واسطہ دے کر اور اپنے اس مقصد سے نکلنے کے حق کے واسطے سے کہ میں ذاتی وہوا وہوس سے نہیں نکلا ہوں۔ نہ دکھانے اور سنانے کے

لیے۔ میں نکلا ہوں تیری خوشنودی کی طلب میں اور تیری ناراضگی سے
بچنے کے لیے تو میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے آتش دوزخ سے محفوظ
رکھ اور مجھے بہشت میں داخل فرما"۔

اور سیوطی نے بھی کتاب "الدعوات" میں ابوسعید خذری سے اس کی روایت کی ہے۔
بزرگوں کا عمل بھی متقدمین سے توسل پر جاری رہا چنانچہ حافظ بن حجر عسقلانی نے اپنی
کتاب "خیرات حسان فی مناقب الامام ابی حنیفة النعمان" میں پچیسویں
فصل میں درج کیا ہے کہ:

"امام شافعی جب بغداد میں تھے تو امام ابوحنیفہ کی ضریح کے پاس آتے
تھے، انہیں سلام کرتے تھے اور اپنی حاجت کے پورا ہونے کے لئے اُن
سے توسّل کرتے تھے"۔

علامہ ابن حجر مکّی نے امام شافعی کے اشعار درج کئے ہیں جو انہوں نے اہلبیت
رسول علیہم السلام کو مخاطب کرکے کہے تھے جن کا مضمون یہ ہے کہ:

"آلِ رسول علیہم السلام میرا ذریعہ ہیں اور وہ اس بارگاہ میں میرا وسیلہ ہیں۔
اُنہی کے واسطے سے مجھے اُمید ہے کہ فردائے قیامت میں میرے داہنے
ہاتھ میں میرا نامۂ اعمال دیا جائے گا"۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ توسّل کی بحث میں خلیفہ دوم عمر کا جناب عباس عم
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طلب باراں کے لئے لے جانا بیان ہو چکا ہے۔

یہاں اُس میں کچھ اضافہ کیا جاتا ہے کہ ابن اثیر جزری نے "اسد الغابہ" میں لکھا ہے کہ:

"عمر بن خطاب نے قحط سالی کی شدّت میں عباس کے ذریعے طلب
باراں کیا اور خداوند عالم نے بارانِ رحمت نازل کیا تو عمر نے کہا بخدا یہ

وسیلہ ہے اللہ کی طرف اور یہ مقام و مرتبہ اُس کی بارگاہ میں۔ اور حسان بن ثابت نے اس مضمون کے اشعار کہے کہ "جب مسلسل قحط سالی رہی تو سب نے خدا سے سوال کیا اور بادل نے عباس کے چہرے کی برکت سے سرابی عطا کی۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور اُن کے والد کے بھائی اور وہ جو دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر آپ کے وارث ہیں، انہی کے ذریعے سے اللہ نے ان شہروں کو زندہ کیا اور وہ خشک ہونے کی حالت کے بعد تر و تازہ ہو گئے۔ اور جب بارش ہوئی تو لوگ عباس کے ہاتھوں کو مس کر کے اپنے منھ پر ملنے لگے اور کہتے تھے "مبارک ہو آپ کو اے حرمین کے سیراب کرنے والے"۔ اور حافظ ابن حجر کی روایت میں ابن عباس ؓ کی زبانی ہے کہ عمر نے دعا میں کہا کہ "خداوندا! ہم تجھ سے طلب باراں کرتے ہیں اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے ذریعے سے اور اُن کی سفید ڈاڑھی کو شفاعت کے لئے پیش کرتے ہیں"۔

اس سے معلوم ہوگا کہ اُن کو جو نیکو کار اور پرہیز گار اشخاص اور مقربین الٰہی سے توسل کریں اس آیت کی زد میں لانا کہ جنہیں مشرکین پکار رہے ہیں خود اللہ کے یہاں کسی وسیلے کی فکر میں ہیں جسے ابن عبدالوہاب نے کتاب التوحید میں درج کیا ہے اور کہا ہے، اس میں اُن مشرکین کی زد ہے جو نیک آدمیوں سے دعا کرتے ہیں اور بہت بڑا شرک ہے۔ حالانکہ اس کے مقابلے میں سورۂ مائدہ میں خالق کا خود حکم موجود ہے کہ "اللہ کے یہاں کے لئے وسیلہ حاصل کرو"۔ اسے نظر انداز کر کے وسیلہ اختیار کرنے کو شرک قرار دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ عمر فاروق کافر اور مشرک ہوں اور اپنے اس قول کی وجہ سے انہوں نے جناب عباس رضی اللہ عنہ کے لئے کہا کہ یہ بخدا اللہ کے یہاں کے لئے وسیلہ ہے اور اس کے یہاں منزل اور مرتبہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرکین کی مذمت وسیلہ بنانے پر اس لئے ہوئی ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو وسیلہ بناتے تھے جو توسّل کے لائق نہیں ہیں یعنی بے جان پتھروں کے بت جبکہ خداوند عالم نے اُن کے تعظیم اوران سے توسّل کا حکم نہیں دیا ہے۔ اس لئے بعض جگہ ہے کہ یہ ایسوں کو پکارتے ہیں جن کے لئے اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے لیکن اس کی بارگاہ میں اپنے حُسن عمل اور اطاعت وعبادت سے قرب حاصل کرنے والے، اُن کے تعظیم وتکریم کی خود اللہ کی طرف سے ہدایت ہے۔ لہٰذا اُن سے توسّل شرک کیونکر ہوسکتا ہے؟ چنانچہ مسلمانوں میں ہر دور میں صالحین و مقربین کے ساتھ توسّل اور اُن کے قبور پر حاضری اور دعا کو حاجت براری کا ذریعہ سمجھنا سلف صالحین میں برابر جاری رہا۔

اصابہ حافظ ابن حجر میں عبدالرحمن بن ربیعۃ بن کعب کے ذکر میں ہے کہ انہیں خلیفۂ ثانی عمر نے باب وابواب پر عامل بنایا اور ترکوں سے جنگ کے لئے بھیجا اور وہ وہیں ترکستان میں دفن ہوئے اور وہاں کے لوگ آج تک اُن کی قبر کے ذریعے سے طلب باراں کرتے ہیں۔

اور یزید ابن اسود کے ذکر میں ہے کہ سلیم بن عامر کا بیان ہے: دمشق میں قحط پڑا۔ معاویہ نے یزید ابن اسود کے واسطے سے طلب باراں کیا، جس سے بارش ہوئی۔

شیخ ابن عربی نے محاضرۃ الابرار میں لکھا ہے کہ علی بن عمرو کاتب نے قرطبہ میں بیان کیا کہ مجھ سے ابوالقاسم ابن بشکوال محدث نے یہ اشعار ابوسعید بن فاضل کے سنائے اور اُن کی قبر قرطبہ میں اسی طرح حاجتوں کے پورے ہونے میں مشہور ہے جیسے معروف کرخی کی قبر بغداد میں اور مفتی محمد رضا صاحب انصاری نے اپنی کتاب "بانی درس نظامی" میں جو ملّا نظام الدین فرنگی محلی کے حال میں تحریر کی ہے لکھا ہے کہ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی نے لکھا ہے:

"قبر مبارک اس وقت میں مفید خاص وعام اور خاص کر مریضانِ علم کے لئے نسخۂ شفا ہے۔ مشہور ہے کہ جس کو مطلب کتاب کا سمجھ میں نہ آتا ہو،

کتاب کھول کر مزار اقدس پر حاضر رہے اور روحانیتِ حضرت سے توجہ کرے، فوراً مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ وھو مجرب

(تذکرہ علمائے فرنگی محل مطبوعہ صفحہ ۱۸۱)

شیعوں میں عموماً اور بعض اہل سنت کا بھی عمل ہے کہ گرنے لگتے ہیں تو "یا علی رضی اللہ عنہ" کہتے ہیں۔ اور سنبھل جاتے ہیں۔ میں نے جیسا کہ "سفرنامۂ حج" میں لکھا ہے کہ مجھے مدینۂ منورہ میں یہ مشاہدہ ہوا کہ چلنے میں مجھے ٹھوکر لگی اور گرنے لگا تو ایک دکان پر سے آواز آئی "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" اور میں سنبھل گیا۔

حقیقت کے لحاظ سے "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" اور "یا علی رضی اللہ عنہ" کہنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہابی مسلک کے لحاظ سے دونوں ہی شرک ہیں۔

اہل سنت کے ایک بڑے طبقے میں "یا شیخ عبدالقادر" کا رواج ہے۔ مفتی محمد رضا انصاری نے اس کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ ملا نظام الدین نے کچھ لوگوں کو جو اُن کے پاس التماسِ دعا کے لئے حاضر ہوئے تھے کہا کہ تم میں سے جو شخص زیادہ دیندار ہو "یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ" کا جس قدر ممکن ہو ورد کرے۔ پھر اس پر فٹ نوٹ لکھا ہے:

> "اس ورد کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں علماء میں اختلاف رائے ہے۔ بعض علماء اس کے پڑھنے کی ممانعت کرتے ہیں۔ کوئی سو سال پہلے اس سلسلے میں ایک صاحب نے جن علماء سے استفتاء کیا تھا اُن میں مولانا رشید احمد گنگوہی دیوبندی بھی تھے۔ انہوں نے بھی کلیۃً اس ورد کو ممنوع نہیں قرار دیا ہے۔ ان علماء کے جوابات کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ کتاب کا نام ہے "فتوی جواز یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ"۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اس کی اجازت دی ہے۔ ان کی

تحریری اجازت مولانا محمد واثق الیقین سجادہ نشین کرسی ضلع بارہ بنکی اور مولانا محمد ناصر فرنگی محلی (حفید ملا نظام الدین) کے پاس میں نے خود دیکھی ہے"۔

یہ کہنا کہ یہ مسلمان قبروں پر عکوف کرتے ہیں یعنی وہاں جم کر بیٹھتے ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ یہ جم کر بیٹھنا اگر تلاوتِ قرآن اور تسبیح و مناجات اور نیک اعمال کے لئے ہو یا اُن لوگوں کی مدد کے لئے جو اس قبر کی زیارت کے لئے آتے ہیں تو اس میں حرج کیا ہے؟ وہ کارِ خیر میں اعانت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اُن الزامات میں سے جو خوش عقیدہ مسلمانوں پر ہیں، ایک بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ان بارگاہوں کی چوکھٹ کا بوسہ لیتے ہیں مگر اس کے کفر و شرک ہونے کی دلیل نہیں ہے جبکہ تعظیم شعائر الٰہیہ کا حکم عمومی موجود ہے اور یہ بوسہ بھی اقسام تعظیم میں سے ہے جس کا حکم حجرِ اسود کے لئے موجود ہے اور اس کے علاوہ کسی چیز کو بوسہ لینے کی ممانعت نہیں ہے تو یہ تعظیم کے عمومی حکم میں داخل رہے گا اور پہلے آچکا ہے اُمّ المومنین عائشہ کا بیان ہے کہ رسول خدا ﷺ نے عثمان بن مظعون کی لاش کا بوسہ لیا اور میں نے دیکھا کہ حضرت ﷺ کے آنسو رخسار ہائے مبارک پر جاری ہیں۔ اس کا شیخ سلیمان حنفی قندوزی نے ینابیع المودۃ میں ذکر کیا ہے اور ابن عباس اور عائشہ دونوں کی روایت ہے کہ خلیفہ اول ابو بکر نے پیغمبر خدا ﷺ کی وفات کے بعد آپ کی لاش کا بوسہ لیا۔ اسے ابن ماجہ نے اپنے سنن میں درج کیا ہے۔ اور قبر کا بوسہ لینے کے حضرت پیغمبر خدا ﷺ کی حدیث کفایہ شعبی اور فتاوی غرائب اور مطالب المومنین اور خزانۃ الروایہ میں ہے کہ اپنے ماں باپ کی قبر کا بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایک شخص پیغمبر خدا ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ یارسول اللہ! میں نے قسم کھائی ہے کہ بہشت کی چوکھٹ اور حورعین کی پیشانی کا بوسہ لوں گا۔ اب میں کیا کروں؟ حضرت ﷺ نے فرمایا کہ ماں کے پیر اور باپ کی پیشانی کا بوسہ لو۔ اس نے کہا کہ یارسول اللہ! اگر میرے ماں باپ زندہ نہ ہوں؟ فرمایا ان کی قبر کا بوسہ لو۔ اس نے کہا کہ اگر ان کی قبر معلوم نہ ہو؟ فرمایا کہ دو

لکیریں کھینچو۔ ایک ماں کی قبر کے خیال سے اور دوسری باپ کی قبر کے خیال سے اور ان دونوں کا بوسہ لو۔ تمہاری قسم پوری ہو جائے گی۔

"تمسح" کے معنی ہیں ہاتھ مس کر کے اپنے منہ پر مل لینا۔ اسے وہابی لوگ رکن یمانی کے لئے جائز و مستحسن سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے مقامات پر بھی عموم حکم تعظیم اور سیرت سلف صالحین اور عدم ثبوت منع شرعی کی بناء پر اُسے جائز و مستحسن سمجھ لینا چاہیے۔ اور پہلے اس کتاب میں آ چکا ہے کہ جب عمر نے عباس کے واسطے سے طلب باراں کیا اور بارش ہوئی تو لوگ عباس کے ساتھ تمسح کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مبارک ہو آپ کو اے حرمین کو سیراب کرنے والے!

اور شفائے قاضی عیاض میں ہے کہ عبداللہ بن عمر کو دیکھا گیا کہ انہوں نے ہاتھ رکھا منبر کے اُس محل پر جہاں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھتے تھے اور پھر اس ہاتھ کو اپنی پیشانی سے لگایا تو اگر تمسح کفر ہو تو اُن تمام صحابہ و تابعین کو کافر سمجھنا پڑے گا۔

یہ کہنا کہ یہ لوگ اپنے کو اُن اولیاء و مقربین کا محتاج سمجھتے ہیں تو بلاشبہ ہر خدا کے بندے کے لئے لازم ہے کہ اپنے کو محتاج سمجھے اور جو اپنے کو بے نیاز سمجھ لے وہ کافر ہے جبکہ قرآن میں سورۂ احزاب میں ہے کہ:

"اے انسانو! تم اللہ کی بارگاہ میں محتاج ہو اور اللہ بس ہے جو بے نیاز اور قابل تعریف ہے"۔

اور سورۂ محمد میں ہے کہ: "اللہ غنی ہے اور تم سب محتاج ہو"۔

اور اولیاء و صالحین کی طرف احتیاج اس لئے ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ہمارے لئے دعا کریں اور مومن دوسرے مومن کا دعائے خیر کے لئے محتاج چہ جائیکہ اولیاء و مقربین اور انبیاء و مرسلین اور ائمہ طاہرین کی طرف۔

یہ کہنا کہ "ان کے ذریعے سے بارش طلب کرتے ہیں تو اس کے متعلق شواہد پہلے آ چکے

ہیں کہ مدینے میں قحط پڑا اور جناب عائشہ سے شکایت کی گئی تو انہوں نے ترکیب بتائی کہ قبر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک حصہ زیر آسمان کر دو۔ چنانچہ بارش ہوئی اور حضرت عمر نے حضرت عباس عم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے سے بارش طلب کی۔

یہ کہ "ہولناک جنگلوں میں انہیں مدد کے لئے پکارتے ہیں اس کے لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت موجود ہے جسے طبرانی نے درج کیا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کی کوئی چیز کھو جائے یا ایسی جگہ موجود ہو جہاں کوئی مددگار نہیں ہے تو کہے "اے بندگانِ خدا میری مدد کرو"۔ ایک روایت میں ہے کہ "میری فریاد کو پہنچو"۔ اس لئے کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جنہیں تم نہیں دیکھتے ہو"۔

یہ کہنا کہ "یہ لوگ لڑکیوں کی شادی وغیرہ کے لئے ان سے التجا کرتے ہیں، بڑے بڑے مطلبوں میں ان پر بھروسہ کرتے ہیں تو بے شک یہ سب اس حد تک درست ہے کہ یہ اُن سے ان مقاصد میں اپنے لئے دعا کے طلب گار ہوتے ہیں اور اس معنی سے اُن سے مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کے بعد یہ کہنا کہ "یہ اُن سے گناہوں کی بخشش کے طالب ہوتے ہیں"۔ ایک جسارت آمیز جھوٹ ہے۔ کوئی مومن گناہوں کی معافی کی التجا خود اُن سے نہیں کرتا بلکہ ان کی شفاعت کا اُمیدوار ہوتا ہے اور اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں اُن کے واسطے سے طالبِ مغفرت ہوتا ہے۔ بے شک وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان ائمہ طاہرین اور مقربین الٰہی کے دامن سے وابستگی ان کی طرف رحمت الٰہی کو متوجہ کرے گی جیسا کہ اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ:

> "میرے اہل بیت کی شان کشتیٔ نوح کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی"۔

اور استغفار کے لئے جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے توسّل کی بحث میں بیان ہو چکا ہے

خداوند نے قرآن میں حکم دیا ہے کہ رسول ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور وہاں آ کر استغفار کریں اور پھر رسول ﷺ اُن کے لئے خدا سے استغفار کریں تو پھر مغفرت الٰہی کا انہیں اُمیدوار ہونا چاہیے اور خود رسول ﷺ کو حکم دیا کہ آپ مومنین و مومنات کے لئے استغفار کیجئے اور سورۂ یوسف میں یعقوب علیہ السلام کے فرزندوں کی زبانی ہے کہ انہوں نے اپنے والد بزرگوار سے کہا کہ ہمارے لئے بارگاہِ الٰہی میں استغفار کیجئے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ میں تمہارے لئے استغفار کروں گا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے منہ بولے باپ سے وعدہ کیا کہ میں آپ کے لئے استغفار کروں گا اور پھر اُس وعدے کی بناء پر استغفار کیا بھی اور قرآن مجید میں سورۂ نوح میں جناب نوح علیہ السلام کی دعا ہے کہ جو مومن میرے گھر میں آئے اُس کی مغفرت فرما۔

یہ کہنا کہ اُن مسلمانوں کے دل میں جو اولیاء الٰہی سے دُعا مانگتے ہیں، خدا کا تصور بالکل نہیں ہوتا مومنین کے ساتھ سوئے ظن بلکہ افتراء اور بہتان ہے۔ اس شخص کو اُن کے دل کا حال کیونکر معلوم ہے؟ یقیناً ذرا بھی بصیرت رکھنے والا ہر صاحب ایمان جانتا ہے کہ اصل مرکز حاجات اللہ سُبحانہٗ ہے اور یہ تمام اولیاء و صالحین اُسی کی عبادت اور اطاعت سے اس مرتبہ تک پہنچے ہیں۔ اس کے خلاف اور اس کے سوا ان کے دل میں ہرگز کوئی دوسرا تصور نہیں ہوتا۔

بیشک عام صوفیاء کے متعلق ہمیں ذاتی طور پر کوئی علم نہیں ہے۔ نہ ہم اُن کے طرف سے وکالت کرنے کے موقف میں ہیں۔ مگر خیال یہ ہے کہ وہ بھی اپنے پیروں، مرشدوں اور اولیاء کے متعلق یہ تصور نہیں رکھتے کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر ذاتاً نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر ہیں۔ لیکن مجدی عالم نے جو اُن کا قول بیان کیا ہے کہ اللہ نے ہر ولی کے ساتھ ایک فرشتہ مقرر کیا ہے جو سوال کرنے والے کی حاجت کو پورا کرے تو اسے ایک بے بنیاد بات سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن کفر یا شرک کا موجب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جبکہ یہ بالکل صحیح ہے کہ خداوند عالم نے کائنات میں مختلف کاموں کے لئے فرشتے مقرر کئے ہیں مثلاً جبرئیل امین وحی ہیں۔ اسرافیل کے ذمے صور پھونکنا ہے، مالک

خزانہ دار جہنم ہیں، رضوان خازن جنت ہیں، عزرائیل ملک الموت ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو اگر بالفرض اللہ کوئی فرشتہ لوگوں کی حاجت براری کے لئے کسی محل خاص پر مقرر کردے تو اس میں کیا خرابی ہے؟ اور یہ اُن آیاتِ قرآنی کے بالکل خلاف نہیں ہے جن کا مضمون یہ ہے کہ اللہ حاجت براری کرتا ہے جیسے پہلے آچکا ہے کہ وفات دینا اللہ کا کام ہے لیکن خود قرآن میں ایک جگہ اس کی نسبت ملک الموت کی طرف دی گئی ہے اور کئی جگہ فرشتوں کی طرف۔

سب سے زیادہ ان وہابیوں کو شاق اہل بیت اطہار علیہم السلام کے عتباتِ عالیات کی جو عراق میں ہیں، مرجعیت و مرکزیت ہے جس میں اس عناد کا دخل ہے جو بعد رسول ﷺ ایک طبقے کو اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین سے ہو گیا۔ اس سلسلے میں یہ لوگ موالیانِ اہل بیت علیہم السلام پر تہمت تراشی اور بہتان طرازی کی انتہا کر دیتے ہیں۔ حالانکہ جو شخص صاف دل اور بے لوث نیت کے ساتھ ان روضوں پر آئے اُسے خالق کریم کی بارگاہ میں خضوع وخشوع اور اُس کی جناب میں اخلاص وعبادت کے وہ نمونے نظر آئیں گے جن کی نظیر کسی دوسرے مقام پر نہ ملے گی اور ان کے سلام اور زیارات کو سنے تو ان کے ہر لفظ سے توحید الٰہی اور اُس کی عظمت کا اقرار نمایاں ہوتا ہے۔ مثلاً امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے روضے پر پہلے جو اذنِ دخول پڑھا جاتا ہے، اُس میں ہے:

''کوئی خدا نہیں سوا اللہ کے وہ ایک اکیلا ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اُس کے بندے اور رسول ہیں جو اُس کی طرف سے حق کو لے کر آئے اور اُس کے پیغمبروں کی تصدیق کی'' (تا آخر مضمون)

ایسے ہی الفاظ تمام زیارتوں اور دعاؤں میں ہیں جو ان مشاہد مقدسہ پر پڑھے جاتے ہیں اور زیارت کے بعد جو دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے، اُس کے بعد کہا جاتا ہے:

''خداوندا! میں نے یہ دو رکعت نماز پڑھی ہے ہدیہ کرنے کے لئے اپنے مولا، تیرے ولیٔ خاص، تیرے رسول کے بھائی، امیر المومنین علی ابن ابی

طالب ﷺ کے لئے۔ خداوندا! تو دُرود بھیج محمد ﷺ و آل محمد علیہم السلام پر اور اس نماز و زیارت کو مجھ سے قبول فرما اور مجھے اس پر وہ جزاء عطا کر جو حُسن عمل رکھنے والوں کو عطا ہوتی ہے۔ اے خدا! میں نے تیرے ہی لئے نماز پڑھی ہے اور تیرے ہی لئے رکوع کیا ہے اور تجھ ہی کو سجدہ کیا ہے۔ تو ایک اکیلا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس لئے کہ نماز اور رکوع و سجود بس تیرے ہی لئے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سوا تیرے کوئی خدا نہیں۔ خداوندا! مجھے میرا مقصد عطا فرما بواسطہ محمد ﷺ و آل محمد علیہم السلام"۔

اور ایسا ہی تمام مشاہد مقدسہ پر ہوتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ان مشاہد مشرفہ پر حاضر ہونے سے توحید کی بنیادیں تازہ مستحکم ہوتی ہیں، مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہوتی ہے اور کفر و الحاد کے تصورات کا استیصال ہوتا ہے۔ اس کے خلاف جو زہر افشانی اور بہتان طرازی ہوتی ہے، اُس کی صحیح پاداش خداوند عالم کے ہاتھ میں ہے جبکہ اس بے بنیاد تصور سے کتنے بے گناہوں کا خون بہایا جاتا رہا ہے اور اُن کی ہتک حرمت کی جاتی رہی ہے۔ جو وہابی کردار کے متعلق بتواتر ثابت ہے۔

نواب صدیق حسن خان قنوجی نے "ابجد العلوم" میں لکھا ہے کہ شیخ محمد حازی شاگرد علامہ شوکانی نے ابن عبدالوہاب کے لئے لکھا ہے کہ ابن عبدالوہاب کی کتابوں میں بعض باتیں قابل قبول ہیں اور بعض رد کر دینے کے قابل ہیں اور سب سے زیادہ مشہور ان کی دو خصوصیتیں ہیں:

ایک تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو کافر سمجھنا۔

دوسرے مسلمانوں کا بغیر ثبوت اور گواہ کے خون بہانا۔

دوسری جگہ ہے کہ وہاں کے جاہل عربوں کو انہوں نے سمجھایا کہ پیغمبر ﷺ یا کسی عالم

سے جو توسّل کرے، وہ مشرک ہو جاتا ہے اور آگے بڑھ کر انہوں نے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو کافر قرار دے دیا۔ چنانچہ محمد بن اسماعیل صنعانی جو بہت بڑے عالم تھے، پہلے انہوں نے ابن عبدالوہاب کے متعلق کچھ ملے ہوئے اطلاعات کے مطابق کی بناء پر مدح میں قصیدہ کہا تھا جس کی ابتداء نجد اور اہل نجد پر سلام سے تھی بعد میں جب معتبر ذرائع سے وہاں کے مزید حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے دوسرے اشعار پہلے قصیدے پر پشیمانی اور توبہ کے مضمون کے کہے اور اس طرح اعلان کیا کہ میں اپنے ان اشعار کو جو میں نے مدح میں کہے تھے، واپس لیتا ہوں کہ اب مجھ پر صورتِ حال اُس کے خلاف ظاہر ہوگئی ہے اور خود اپنے ان دوسرے اشعار کی شرح لکھی جس کا نام "محو الحوبة فی شرح ابیات التوبه" یعنی "گناہ کا مٹانا توبہ والے اشعار کی شرح میں" اس میں لکھا ہے کہ پہلے ایک نجدی عالم نے آکر ابن عبدالوہاب کی بڑی تعریف و توصیف کی تھی جس کی بناء پر میں نے وہ قصیدہ کہا۔ لیکن بعد میں مجھے ابن عبدالوہاب کی بہت سے قابلِ اعتراض باتیں معلوم ہوئیں جیسے خونریزی اور لوٹ مار اور دھوکا دے کر خاص خاص افراد کی جان لینا اور تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو کافر قرار دینا اور اس سلسلے میں خود ابن عبدالوہاب کے بعض رسالے ہم تک پہنچے ہیں جن میں انہوں نے تمام مسلمانوں کے کافر ہونے کے بخیال خود دلائل تحریر کیے ہیں تو ہم نے ان کے حال کو ایسا پایا کہ جیسے کوئی شخص تھوڑا علم شریعت کا حاصل کرے مگر اس نے غور و فکر سے کام نہ لیا ہو اور نہ کسی ایسے استاد سے پڑھا ہو جو اُسے صحیح راستہ دکھائے، بلکہ اس نے بطور خود شیخ ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد ابن قیم جوزیہ کے کچھ تصانیف کا مطالعہ کیا اور بے سمجھے ہوئے اُن کی تقلید کرلی ہو حالانکہ خود وہ دونوں تقلید کو حرام قرار دیتے ہیں۔

سید محمد امین بن عمر معروف بابن عابدین نے اپنی کتاب "رد المحتار" کی تیسری جلد میں "بغاۃ" کے ذکر کے ذیل میں لکھا ہے:

"جیسا کہ اس زمانے میں ابن عبدالوہاب کے تابعین میں ہوا جنہوں نے

نجد سے خروج کیا اور حرمین مکہ و مدینہ پر قبضہ کرلیا۔ یہ لوگ حنبلی ہونے کے دعویدار تھے۔ لیکن انہوں نے یہ عقیدہ اختیار کیا کہ بس وہ مسلمان ہیں اور اُن کے مخالف جتنے ہیں سب مشرک ہیں اور اس طرح اہل سنت اور اُن کے علماء کے قتل کو مباح سمجھا۔ یہاں تک کہ خدا نے ان کی طاقت کو توڑا اور اُن کے شہروں کو برباد کیا اور ۱۲۳۳ھ میں مسلمان اُن پر غالب آئے"۔

خود وہابی عالم سلیمان بن عبداللہ بن محمد محمد بن عبدالوہاب نے اپنی کتاب "توضیح" میں لکھا ہے کہ:

"اہلِ توحید کے لئے ان مسلمانوں کے اموال اور عورتیں سب حلال ہیں اور وہ انہیں غلام اور کنیز بنا سکتے ہیں"۔

یہ درحقیقت ان کے پہلے خوارج نہروان کا مذہب رہا ہے جنہوں نے جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور ان کے ساتھ کے تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا اور اُن کے جان و مال کو مباح سمجھا اور غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو بہت باتوں میں یہ وہابی لوگ اُنہی خوارج کے ہم مسلک ہیں۔ جیسے وہ نعرے لگاتے تھے کہ "حکم بس اللہ کے لئے ہے" یہ جملہ حق تھا مگر مقصد ان کا باطل تھا۔ اُسی طرح ان کا نعرہ ہے کہ تعظیم صرف اللہ کے لئے ہے، دعا بس اللہ سے مانگی جائے۔ محبت بس اللہ سے رکھی جائے۔ یہ سب جملے درست ہیں مگر مقصود ان سے غلط ہے۔

پھر جب تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ خوارج کی اہم شخصیتیں سب نجدی تھیں۔ چنانچہ اُن کا سپہ سالار جنگ میں شیث بن ربعی اور ایک بڑا سردار مسعر بن فدکی دونوں تمیمی تھے اور ابن عبدالوہاب کا قبیلہ بھی بنی تمیم ہے اور وہابی جماعت کے فرقۂ خوارج میں سے ہونے کا انکشاف شیخ محمد بن یوسف مشہور لقب "کافی" نے اپنی کتاب "الحصن والجنة علی عقیدة اہل السنة" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"آج کل یہ ذہنیت چل پڑی ہے کہ اولیائے الٰہی کے کرامات کا انکار کیا

جاتا ہے اور اُن کے قبور کی زیارت کو منع کیا جاتا ہے اور اُن کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں توسّل سے انکار کیا جاتا ہے۔ یہ اصل میں اطراف بغداد میں بعض خوارج کا مذہب تھا۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ جس نے کسی قبر کی زیارت کی، وہ ایسا ہے جیسے اُس نے کسی بت کی پرستش کی اور یہ سب باطل ہے۔ اس لئے کہ خود رسول خدا ﷺ قبرستان زیارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور تمام اُمّت کا اس پر اجماع رہا ہے۔ ایسے لوگوں سے بحث کرنا بالکل بیکار ہے''۔

آلوسی مصنف ''تاریخ نجد'' اگرچہ خود وہابیت کی طرف مائل ہیں جو اُن کے انداز تحریر سے ظاہر ہے لیکن کچھ نہ کچھ حق بات اُن کے قلم کی زبان پر بھی جاری ہوگئی ہے۔ اُنہوں نے سعود بن عبدالعزیز کے حال میں لکھا ہے کہ اُنہوں نے اپنے لشکر ہر طرف بھیجے اور تمام بڑے بڑے روسائے عرب کا سر اُن کے سامنے جھک گیا مگر یہ کہ اُنہوں نے حج سے روک دیا اور خلیفۃ المسلمین کے مقابلے میں خروج کیا اور اپنے مخالف مسلمانوں کو کافر قرار دینے میں غلو سے کام لیا اور کچھ حکموں پر بڑا تشدد کیا اور انہوں نے اکثر باتوں کو (جیسے خدا کے ہاتھ، چہرہ اور آنکھیں وغیرہ) ظاہری مفہوم پر محمول کیا۔ ہاں دوسرے لوگ ان کی مخالفت میں بھی حد سے بڑھ گئے اور انصاف کا تقاضا ہے کہ درمیانی راستہ اختیار کیا جائے۔ نہ اتنا تشدد ہونا چاہیے جیسا علمائے نجد اور اُن کے عوام میں ہے کہ مسلمانوں سے جنگ کا نام وہ ''جہاد'' رکھتے ہیں اور حج کو روکتے ہیں اور یہ اُس تساہل سے کام لینا چاہیے جو عام طور پر شام اور عراق کے باشندوں میں ہے کہ غیر خدا کی قسم کھاتے ہیں اور بڑی سونے اور چاندی سے آراستہ اور رنگ برنگ کی منقش عمارتیں صالحین و مقربین کے قبور پر بناتے ہیں اور اُن کے لئے نذر کرتے ہیں اور ایسی ہی باتیں جن سے شارع نے منع کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دین کے بارے میں افراط یا تفریط کوئی رُخ مسلمانوں کی شان کے لائق نہیں ہے بلکہ مناسب یہی ہے کہ

سلف صالحین کی پیروی کی جائے اور ایک دوسرے کو کافر کہنا غضب الٰہی کا باعث ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ لوگ تمام مسلمانوں کا کافر کہتے ہیں تو اب رسول خدا ﷺ کی یہ حدیث دیکھیے جو صحیح بخاری میں ہے کہ:

''جو کسی کو کافر کہے تو اُس کی زد میں اُن دونوں میں سے ایک ضرور آئے گا یعنی اگر وہ مسلمان جسے کافر کہے ہے، واقعاً کافر نہیں ہے تو لازماً کافر کہنے والا پیش خدا کافر قرار پائے گا''۔

اس کے علاوہ یہ پہلے آچکا ہے کہ یہ لوگ مجسمہ میں داخل ہیں اور مجسمہ کو تمام علمائے اسلام کافر کہتے ہیں۔ پھر اہل بیت رسول علیہم السلام سے دشمنی جسے پیغمبر خدا ﷺ نے کفر کا مصداق قرار دیا ہے۔ پھر خوارج کے کفر پر علمائے اسلام متفق ہیں یہاں تک کہ ابن عبدالوہاب کی کتاب ''التوحید'' کے شارح نے بھی لکھا ہے کہ:

''رسول خدا ﷺ نے خوارج کے لئے گواہی دی ہے کہ وہ کثرت سے نماز، روزہ اور تلاوتِ قرآن کے کام انجام دیتے ہوں گے، اور لا الٰہ الا اللہ کا کلمہ پڑھتے ہوں گے اور اس کے باوجود محکوم بکفر ہیں اور حضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں اس زمانے میں ہوں تو انہیں قتل کر دوں جیسا کہ صحیحین میں ہے''۔

پھر جیسے خوارج اُن آیات کو جو کفار و مشرکین کے بارے میں ہیں مسلمین و مومنین پر منطبق کرتے تھے، اسی طرح یہ وہابی حضرات تمام آیتوں کو جو مشرکین کے بارے میں ہیں، مسلمانانِ عالم پر منطبق کرتے ہیں۔ جیسا کہ ابن عبدالوہاب کی اُس عبارت سے جسے آلوسی نے نقل کیا ہے، معلوم ہو گیا اور ابن عبدالوہاب نے اس بارے میں مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے ''کشف الشهاب فی التشکیک بالمتشابهات'' جس میں بڑی تفصیل کے

ساتھ اُن شرک والی آیتوں کو مسلمانوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی اطلاع بھی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دے دی تھی جیسا کہ بخاری نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے خوارج کے وصف میں کہ انہوں نے اُن آیتوں کو جو کافروں کے بارے میں ہیں، مومنین کے بارے میں قرار دے دیا اور ایک روایت میں ابن عمر کی جسے بخاری کے علاوہ دوسروں نے نقل کیا ہے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

''سب سے زیادہ مجھے اپنی اُمت کے لئے جو پریشانی ہے وہ اس شخص سے ہے جو قرآن کی آیتوں کو بے محل صرف کرے''۔

اس کا ابن دحلان نے ذکر کیا ہے اور جس طرح خوارج نے مسلمانوں کا خون مُباح سمجھ لیا تھا اور ناحق مومنین کی خونریزی جائز سمجھی تھی، اسی طرح ان وہابیوں نے ان بے شمار مسلمانوں کو تہ تیغ کیا۔ چنانچہ ''کشط الاباب'' میں ہے کہ اُن کے ہاتھوں جو مسلمان قتل ہوئے اُن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ اور طائف میں امان دینے کے معاہدے کے بعد انہوں نے قتل عام کیا۔ حالانکہ ارشادِ الٰہی ہے کہ:

''جو کسی ایک مومن کو قتل کرے، وہ ایسا ہے کہ اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا''۔

چہ جائیکہ وہ لوگ جنھوں نے ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر دیا ہو اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اُسے قتل کرنا کفر ہے''۔

اسے ابن ماجہ نے اپنے سنن میں درج کیا ہے۔ نیز ارشادِ الٰہی ہے کہ:

''جو ایک مومن کو قتل کرے، اُس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اُس پر لعنت کرے گا اور اُسے بڑا عذاب کرے گا''۔

پانچواں باب
وہابی عقیدہ انبیاء وصالحین کے قبور کے بارے میں

اُن کا مذہب یہ ہے کہ قبور پر کوئی عمارت بنانا حرام ہے اور نہ اُن کے گرد کوئی عمارت بنانا چاہیے اور وہاں دعا مانگنا اور نماز پڑھنا، یہ سب باتیں حرام ہیں، بلکہ ان سب کا انہدام اور ان کا مٹادینا واجب ہے۔ یہاں تک کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک، اس کا بھی یہی حکم ہے۔ ابن عبدالوہاب اور اُن کے تابعین کے نزدیک یہ مشاہد اور قبور سب مثل بتوں کے ہیں اور قبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ (معاذ اللہ) سب سے بڑا بت سمجھتے ہیں۔

ان تمام اقوال میں بھی ان کے پیشوا، وہی ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد ابن قیم ہیں۔ چنانچہ ابن قیم نے اپنی کتاب "زادالمعاد فی ھدی خیر العباد" میں تصریح کی ہے کہ ان روضوں کا جو قبور پر بنے ہوئے ہیں، جہاں تک قدرت ہو، گرانا واجب ہے اور ان کا ایک دن بھی باقی رکھنا حرام ہے، اس لئے کہ یہ لات اور عزیٰ (اصنام) کے مثل ہیں بلکہ اُن سے بڑھ کر یہاں شرک ہوتا ہے اور حاکم وقت پر لازم ہے کہ اُن اموال کو جو روضوں کے لئے لائے جاتے ہیں، لے کر دوسرے مصارف میں صرف کردے جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لات (بت) کے اموال کے

ساتھ کیا تھا۔ اسی طرح ان عمارتوں کو گرانا واجب ہے یا یہ کہ فروخت کر کے اُن کی قیمت مسلمانوں کے مفاد کے کاموں میں صرف کرے۔ اسی طرح ان اوقاف کو جو ان سے متعلق ہیں۔ اس لئے کہ وقف ان پر باطل ہے اور یہ مال جو ضائع ہو رہا ہے لہٰذا اُسے صرف کر دینا چاہیے، مسلمانوں کے کاموں میں۔ اور جلد دوم میں لکھا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ نے مسجد ضرار کو منہدم کر دیا تو یہ مزارات کی جو عمارتیں ہیں کیونکر قابل انہدام نہ ہوں گی۔ اور نیک کام کے خلاف کوئی وقف صحیح نہیں ہے۔ اور وہ مسجد بھی جو کسی قبر پر ہو منہدم کر دینا چاہیے جس طرح اُس میت کو جو مسجد میں دفن ہو قبر کھود کر نکال دینا چاہیے کیونکہ دین اسلام میں مسجد اور قبر دونوں اکٹھا نہیں ہو سکتے بلکہ جو پہلے ہو، وہ صحیح ہے اور جو بعد میں ہو، اُسے منع کیا جائے گا۔

اب اس محل پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نجد کے قاضی القضاۃ ابن بلیہد کے استفتاء اور اُس جواب کو جو علمائے مدینہ کی طرف منسوب کر کے انہدامِ جنت البقیع کے موقع پر شائع ہوا تھا، یہاں درج کیا جائے جس سے اُن کا عقیدہ اس سلسلے میں بالکل ظاہر ہو جائے گا۔ بعد میں ہم اُن دونوں کے مندرجات کی کافی دوانی رد کریں گے۔

استفتاء

کیا قول ہے علمائے مدینہ منورہ کا (خدا اُن کی سمجھ اور علم میں زیادتی کرے) قبروں پر عمارت اور انہیں مسجد بنا لینے کے بارے میں، یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور جبکہ وہ ناجائز ہے بلکہ اُس کی سختی سے ممانعت ہے تو کیا اُن کو گرانا اور ان کے پاس نماز پڑھنے کو روکنا واجب ہے؟ اور جب وہ عمارت ایک وقفی زمین پر ہو جیسے بقیع اور وہ مانع ہو اُس مقدار میں فائدہ اٹھانے سے جس پر عمارت ہے تو کیا یہ غصب ہے جس کا ختم کرنا ضروری ہے تا کہ دوسرے مستحقین پر ظلم نہ ہو اور ان کے حقوق مارے نہ جائیں۔ یا یہ واجب نہیں ہے؟ اور جو کچھ جاہل لوگ ان ضریحوں کے پاس کرتے ہیں کہ اُن سے تمسّح کرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ ساتھ اُن سے دعا مانگتے ہیں اور قصد قربت کرتے ہیں اُس صاحب قبر

سے اور اُس کی نذر مانتے ہیں اور وہاں روشنی کرتے ہیں یہ سب جائز ہے یا نہیں؟ اور جو یہ لوگ حجرۂ رسول ﷺ کے پاس کرتے ہیں کہ دعا وغیرہ کے وقت اُدھر رُخ کرتے ہیں اور طواف کرتے ہیں اور بوسہ لیتے ہیں اور تمسح کرتے ہیں، اسی طرح جو مسجد شریف میں کرتے ہیں کہ ترحیم اور تذکیر کرتے ہیں اذان اور اقامت کے بیچ میں اور نماز جمعہ کے پہلے۔ کیا یہ شرع میں وارد ہے یا نہیں؟

اس سوال کی غلطی بلکہ غلط بیانی

اس سوال میں ایک بڑی غلط بیانی موجود ہے کہ بقیع کی زمین وقفی ہے۔ اور یہ عمارتیں حقداروں کو اُن کے حقوق سے روکتی ہیں، اس لئے اُن کا ہٹانا واجب ہے۔ اور اس کی تائید اس مفروضے پر شافعی کے قول سے ہوگی کتاب الام میں ہے کہ قبر کی عمارت اگر وقفی زمین پر بنائی گئی ہو تو اس کا گرانا واجب ہے۔ یہ غلط اس لئے ہے کہ کتب تاریخ وسیر کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بقیع کی عمارتیں کسی وقفی زمین پر نہیں ہیں بلکہ تمام مملوکہ زمینوں پر بنی ہیں چنانچہ صاحب وفاء الوفاء نے ابراہیم فرزند پیغمبر ﷺ کی قبر کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک گھر تھا جو بعد میں محمد بن زید بن علی کی ملکیت میں آیا۔ پھر اسی قبر کے پہلو میں عثمان بن مظعون اور پھر یہیں عبدالرحمن بن عوف کی قبریں بنیں۔ یہ سب ایک قبے میں تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قبہ مملوکہ زمین پر تھا۔ پھر ازواج رسول ﷺ کا قبہ، وہ ملکیت تھا، عقیل ابن ابی طالب کی۔ اس کا بھی ذکر وفاء الوفاء میں ہے۔ اب رہا ائمہ اہل بیت علیہم السلام کا قبہ تو کتب سیر سے ظاہر ہے کہ یہ جناب عباس بن عبدالمطلب کا قبہ تھا۔ چنانچہ صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی میں امام محمد باقر علیہ السلام کے حال میں ہے کہ وہ اپنے پدر بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ امام حسن علیہ السلام اور عباس کے قبہ میں جو بقیع میں ہے۔ اور عباس کے قبہ کے لئے باخبر مصنفین نے لکھا ہے کہ عقیل کے مکان کے گوشے میں تھی۔ چنانچہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب "جذب القلوب الی دیار المحبوب" میں لکھتے ہیں کہ:

"عباس بن عبدالمطلب کو بھی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم کے قبہ کے نزدیک

مقابر بنی ہاشم کے شروع میں جو عقیل کے مکان کے گوشے میں ہے دفن کیا''۔

اس سے ثابت ہوا کہ یہ قبہ بھی مملوکہ زمین میں تھا۔ اور علامہ سید ابراہیم راوی رفاعی نے اپنی کتاب ''اوراق بغدادیہ'' میں لکھا ہے کہ امام شافعی کا قبہ ابن عبدالحکیم کے گھر میں تھا۔ رہ گئی بقیع کی سرزمین، اس کا وقف ہونا ثابت نہیں ہے۔

علاوہ اُن تصریحات کے جو پہلے اس زمین کے مملوک ہونے کے متعلق آچکے ہیں، گزشتہ صدیوں میں برابر علمائے اسلام کا اس پر اعتراض نہ کرنا بھی بتاتا ہے کہ اُن کے نزدیک ان قبوں میں کوئی شرعی محذور نہ تھا اور مسلمانوں کا ہر دور میں ان کی تعمیر و درستی کی طرف متوجہ رہنا ان کے نزدیک اُن کے استحسان کی دلیل ہے اور اگر وہابیین انتہائی دھاندلی سے کام لے کر اُن تاریخی تصریحات کو قبول نہ کریں جو ان کی زمین کے مختلف اشخاص کی ملکیت ہونے کو بتاتے ہیں، حالانکہ یہ انصاف سے بہت دُور ہے، اس لئے کہ تاریخی واقعات میں اہلِ تاریخ کے بیان پر اعتماد کے سوا چارۂ کار نہیں ہے۔ پھر بھی جب حدیث اور تاریخ میں اس کا پتہ نہیں ہے کہ یہ زمین پہلے کس کی ملکیت تھی اور اس نے اُسے وقف کیا تو سمجھنا ہوگا کہ وہ ابتدائی حالت پر باقی ہے کہ تمام زمین ملکِ خدا ہے اور تمام خلق کے لئے مُباح ہے اور اُس کا حکم یہ ہے کہ کوئی قطعہ زمین کو محدود بنا کر اُس پر کوئی عمارت بنا لے، وہ اُس سے مخصوص ہو جائے گی۔ پھر کسی دوسرے کو اس کا منہدم کرنا جائز نہ ہوگا۔

یہ تھی وہ غلطی اور غلط بیانی جو اصل سوال میں تھی اور وہ سوال علماء سے چونکہ کسی عامی جاہل کا نہ تھا بلکہ ایک بڑی وہابی شخصیت یعنی اُن کے قاضی القضاۃ کا تھا لہٰذا اس پر نظر ڈالنا ضروری تھا۔ اب اُس کا جواب جو علمائے مدینہ کی طرف منسوب کر کے نجدی حکومت نے شائع کیا تھا، وہ ملاحظہ ہو:۔

جواب

قبروں پر عمارت بنانا اجماعاً ممنوع ہے۔ اس لئے کہ اس کی ممانعت میں جو احادیث ہیں، وہ صحیح السند ہیں۔ لہٰذا بہت سے علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ ان کا گرانا واجب ہے۔ اور اس میں

وہ سند پیش کرتے ہیں حضرت علی علیہ السلام کی حدیث کی کہ آپ نے ابوالسیاج سے فرمایا کہ میں تمہیں اس مہم کے لئے بھیجتا ہوں جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا کہ جو مورت تمہیں ملے اُسے مٹادو اور جو قبر اونچی ملے اُسے برابر کردو۔ اس کی مسلم نے روایت کی ہے اور قبروں پر مسجدیں بنانا اور وہاں نماز پڑھنا مطلقاً ممنوع ہے۔ اور وہاں چراغ جلانا بھی ممنوع ہے، ابن عباس کی حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت کی ان عورتوں پر جو قبروں کی زیارت کے لئے جائیں اور ان لوگوں پر جو وہاں مسجدیں بنائیں اور چراغ روشن کریں۔ اس کی اہل سنن نے روایت کی ہے۔ جاہل لوگ جو ضریحوں کے ساتھ تمسح کرتے ہیں اور بقصدِ قربت جانور ذبح کرتے ہیں اور نذریں دیتے ہیں اور اللہ کے ساتھ ان صاحبانِ قبور سے دعائیں مانگتے ہیں، یہ سب حرام ہے اور شرعاً ممنوع ہے جس کا کرنا بالکل جائز نہیں ہے۔ اور دعا کے وقت حجرۂ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منہ کرنا، اسے بھی بہتر ہے کہ روکا جائے جیسا کہ مشہور و معروف مذہبی معتبر کتابوں میں درج ہے اور تمام سمتوں سے بہتر سمت کعبہ ہے اور طواف اور تمسح اور ترحیم اور تسلیم مذکورہ اوقات میں، یہ سب بعد کی ایجاد کی ہوئی چیزیں ہیں جو میری ناقص سمجھ میں آیا ہے، وہ یہ ہے اور ہر صاحب علم سے بالاتر ایک بڑا عالم ہے۔

۲۵ رمضان ۱۳۴۴ھ

جوابِ مذکور کی رَدّ میں

علمائے مدینہ کے اس فتوے کی رَدّ علامہ سید حسن صدر اور علامہ شیخ جواد بلاغی وغیرہ ایسے بزرگ علماء نے کی ہے مگر یہاں اُس کے ایک جزء کی مکمل رَدّ لکھی جاتی ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ قبور پر تعمیر کا جواز کتاب الٰہی اور سنّت مصطفوی اور مسلمانوں کے عمل درآمد سب سے ثابت ہے۔

کتاب الٰہی میں اس موقع کے ذکر میں جب لوگوں کو اطلاع ہوئی اور وہ لوگ اُس غار

کے پاس آئے جہاں اصحاب کہف محوِ آرام تھے، یہ آیت ہے کہ:

''اُن سب نے کہا کہ اُن پر ایک عمارت قائم کرو، اُنہوں نے جو ان کے سلسلے میں غالب آئے، کہا کہ ہم اُن پر مسجد تعمیر کریں گے''۔

انداز بیان سے ظاہر ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کے اس فیصلے کو جو اُنہوں نے کیا بصورتِ استحسان درج کیا ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں انبیائے ماسلف اور اُمم سابقہ کے حالات صرف تفریح طبائع کے لئے درج نہیں ہوتے بلکہ اس لئے کہ اُن سے اس اُمت کو درس حاصل ہو تو اگر عمارت بنانا قبر پر اللہ کے نزدیک اس اُمت کے لئے قابلِ مذمت امر ہوتا تو وہ اس واقعہ کے درج کرنے میں اس پر متنبّہ فرماتا تاکہ اس اُمت کے افراد اس سے پرہیز کریں۔ جب ایسا نہیں ہوا اور اُس نے اس واقعہ کو اس انداز میں بیان فرمایا تو اس سے اس کی تائید ہوئی اور یہ ظاہر ہوا کہ یہ فیصلہ اُس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوا اور وہ اس لائق ہے کہ اس اُمت کے افراد اس کی پیروی کریں اور حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کے علاوہ اگر اس مدعا کے لئے کوئی دلیل نہ ہوتی تو بس یہ آیت اُس کے ثبوت کے لئے کافی تھی۔ مگر چونکہ یہ وہابیوں کے عقیدے کے بالکل خلاف ہے اس لئے ابن عبد الوہاب کی کتاب "التوحید" کے شارح نے اسے درج کرنے کے بعد لکھ دیا ہے کہ:

''یہ اس کی دلیل ہے کہ جو اُن کے معاملے میں غالب آئے وہ کافر تھے۔ اس لئے کہ اگر وہ مومن ہوتے تو یہ فیصلہ نہ کرتے کہ نیک اعمال اشخاص کی قبروں پر مسجد بنائیں جبکہ ہمارے پیغمبر ﷺ نے ایسا کرنے والے پر لعنت کی ہے''۔

یعنی انہوں نے اپنے مسلک کو اصل قرار دے کر قرآن کو اپنا تابع بنانا چاہا ہے اور اس لئے ہزاروں مسلمانوں پر کفر کے فتووں کا سیلاب اُن کا اتنا بڑھ گیا کہ گذشتہ دور کے سچے مسلمانوں پر بھی وہ فتوائے کفر لگانے لگے مگر اول تو پوری آیت پڑھیے تو پتہ لگے گا کہ عمارت بنانے

پر دونوں فریق متفق تھے۔ اختلاف بس یہ تھا کہ عمارت کس طرح کی ہوگی؟ تو اگر وہ بالفرض غالب آنے والے کافر ہوں، تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پھر یہ کہ مفسرین تصریح کرتے ہیں کہ غالب آنے والے مومنین تھے۔ چنانچہ معالم التنزیل بغوی میں ہے کہ:

''مسلمانوں نے کہا کہ ہم ان پر مسجد کی تعمیر کریں گے جس میں پروردگار عالمیاں کے لئے لوگ نمازیں پڑھیں''۔

خازنؒ نے لباب التاویل میں لکھا ہے کہ:

''ابن عباس نے اس عمارت کے بارے میں فرمایا کہ مسلمانوں نے کہا ہم ان پر مسجد بنائیں گے جس میں لوگ نمازیں پڑھیں، اس لئے کہ یہ ہمارے دین پر تھے''۔

اسی طرح کے الفاظ تفسیر جلالین اور کشاف اور تفسیر السعود میں ہیں۔ اور تنویر المقباس ابن عباس'' میں ہے کہ:

'''''جو غالب آئے'' وہ مومنین تھے، انہوں نے کہا کہ ہم ان پر مسجد بنائیں گے کہ یہ ہمارے دین پر تھے''۔

اور نیشاپوری نے غرائب القرآن میں لکھا ہے کہ:

''جو غالب آئے وہ مسلمان جماعت تھی اور اُن کا بادشاہ مسلمان تھا، اس لئے انہوں نے وہاں مسجد بنائی جس میں مسلمان نماز پڑھیں اور اُن کے اس محل قیام سے برکت حاصل کریں اور ان ہی کو زیادہ حق تھا اُن قبور کی حفاظت کے لئے عمارت بنانے کا''۔

اس سب کے بعد کیا اس شخص کا یہ کہنا درست ہوسکتا ہے کہ وہ غالب آنے والے معاذ اللہ کافر تھے جبکہ اتنے بڑے مفسرین جن میں ترجمان القرآن ''حبر الامۃ ''عبداللہ بن عباس

بھی ہیں، انہیں اہلِ اسلام وایمان بتارہے ہیں۔

اس کے بعد آیئے سنت پر نظر ڈالیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری گفتگو یہاں اس جماعت کے مقابلے میں ہے جن کے یہاں معیار سنت میں ایک تو وہ چیز ہے جو ہمارے اور اُن کے درمیان مشترک ہے یعنی سنت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس میں آپ کا قول، فعل اور تقریر داخل ہے اور ایک بات میں وہ ہم سے الگ ہیں یعنی وہ صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی بھی ضروری سمجھتے ہیں اور اس حدیث کو مانتے ہیں کہ میرے اصحاب مثل ستاروں کے ہیں کس کی پیروی کروگے، ہدایت پاؤ گے۔ تو اب ہمیں لازم ہے کہ قبروں کی تعمیر کے سلسلے میں پہلے سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کریں۔ پھر سیرتِ صحابہ وتابعین کہ یہ سب حجت قائم ہونے کے لئے کافی ہے۔

(۱)

عثمان بن مظعون کی قبر کے لئے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل

نورالدین سمہودی نے وفاء الوفاء میں لکھا ہے کہ:

''محمد بن قدامہ کی روایت ہے کہ اُن کے باپ کے ذریعے اُن کے دادا سے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عثمان بن مظعون کو دفن کیا تو حکم دیا کہ اُن کی قبر کے سرہانے ایک پتھر رکھ دیا جائے۔ قدامہ کا بیان ہے کہ جب عرصے کے بعد ہم بقیع میں گئے تو اُس پتھر کو دیکھا اور سمجھے کہ یہ عثمان بن مظعون کی قبر ہے''۔

دوسری روایت میں ہے کہ:

''حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ پتھر میں اس لئے رکھواتا ہوں کہ میرے بھائی کی قبر کا اُس سے علم ہو اور اُس کے پاس اپنے عزیزوں میں

جس کا انتقال ہو اُسے میں دفن کروں"۔

اور ظاہر ہے کہ کسی حکم یا عمل کے ساتھ جب وجہ بتادی جائے تو وہ وجہ جس صورت سے زیادہ حاصل ہو، وہ حکم وہاں بدرجہ اولیٰ جاری ہوگا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پتھر رکھنے کی وجہ یہ بتائی کہ اس سے قبر کا علم ہو اور اُس سے اُس کے پاس دوسرے قبور بنائے جا سکیں اور ظاہر ہے کہ ضریح یا قبہ بنانے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے جو اُس سے بدرجہ اتم پورا ہوتا ہے تو عمل حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا اُس کے استحسان کا ثبوت ہوگا۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بہت سے صحابہ کی وفات ہوئی مگر کسی کے لئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اہتمام نہیں فرمایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سب دفن ہونے والے یکساں نہیں ہوتے اور اُسی لحاظ سے سب کی قبریں یکساں نہیں ہونا چاہئیں بلکہ بعض کو امتیاز خاص ہوتا ہے۔ خواہ سبقت ایمانی کی وجہ سے یا دینی اعزاز کی وجہ سے اور وہ ابتدائی اسلام کا دور بے سروسامانی کا تھا۔ لہٰذا جو عام معیار زندگی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر دوسرے مسلمانوں کا تھا، اُس کے لحاظ سے ضریح اور قبے وغیرہ کی تعمیر ممکن نہ تھی، لہٰذا اُس وقت کے لحاظ سے امتیازی علامت جو ہوسکتی تھی، اُس کا عثمان بن مظعون کے لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظام کر دیا اور جب عام معیار زندگی مسلمانوں کا اونچا ہوگیا تو اسی لحاظ سے انبیاء و اولیاء کے قبور کے لئے امتیازی نشان کے طور پر عمارتوں میں ترقی ہونے لگی۔ جو ہونا چاہیے تھی اور جتنا مرتبہ جس کا زیادہ ہو، اس کے لحاظ سے اس میں اضافہ ہونا چاہیے۔

(۲)

ابراہیم فرزندِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر عمارت

اُسی کتاب وفاء الوفاء میں ابن زبالہ کی روایت ہے:

''سعید بن محمد بن جبیر سے کہ انہوں نے ابراہیم فرزند پیغمبر خدا ﷺ کی قبر دیکھی ''زوراء'' کے پاس۔ عبدالعزیز بن محمد نے کہا یہ وہ گھر ہے جو بعد میں زید ابن علی علیہ السلام کی ملکیت میں آیا''۔

اگر عمارت کا ہونا قبر پر جائز نہ ہوتا تو رسول خدا ﷺ اپنے فرزند ابراہیم کو گھر کے اندر کیوں دفن کرتے اور اگر ہم بالفرض یہ مانیں کہ قبر صحن میں تھی، جب بھی دیواریں صحن کی تو قبر کے گرد ہوں گی، حالانکہ وہابی لوگ اسے بھی ممنوع سمجھتے ہیں۔

(۳)

حضرت خاتونِ جنت کی سیرت

وفاء الوفاء میں امام محمد باقر علیہ السلام کی روایت ہے کہ:

''جگر گوشۂ رسول خدا ﷺ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا جناب حمزہ رضوان اللہ علیہ کی قبر کی زیارت کو جاتی تھیں اور اس کی مرمت کراتی تھیں اور درست کرتی تھیں اور انہوں نے بھی اس کی شناخت کے لئے ایک پتھر رکھ دیا تھا''۔

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ عمل حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا اپنے والد بزرگوار کے دور حیات میں تھا اور ظاہر ہے کہ حضرت سرور کائنات ﷺ کے علم میں تھا، اس لئے وہ تقریر رسول ﷺ میں داخل ہو کر جزء سنت رسول خدا ﷺ قرار پاتا ہے۔ اور یہ بالکل وہابی نظریے کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ وہ خاص طور پر خواتین کے لئے قبر کی زیارت کو قطعاً ممنوع سمجھتے ہیں اور پھر قبور کے امتیاز کو مطلق منع کرتے ہیں۔ مگر جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا قبر حمزہ کی برابر مرمت کرتی رہتی تھیں۔ اگر اس کی بقاء ضروری نہ سمجھتیں تو وقتاً فوقتاً اس کی خبر کیوں لیتیں اور جب حفاظت قبر کا مستحسن ہونا اس عمل سے ظاہر ہو گیا تو قبے کی تعمیر کرنا جو اس مقصد کو پورا کر سکتا ہے کیوں مستحسن نہ ہو گا؟

(۴)

قبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے حضرت علی علیہ السلام اور تمام اہل بیت وصحابہ کا عمل

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر قبر پر عمارت بنانا ممنوع ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، پہلے سے ہو اور اس میں قبر بنائی جائے یا قبر پہلے ہو اور اس پر عمارت تعمیر کی جائے۔ کیونکہ معیار دونوں میں ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ زیارت کے لئے آئیں گے، اور وہ عمارت اُن کے لئے باعثِ آرام ہو گی۔ اب اگر یہ چیز ممنوع ہو تو خود حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حجرۂ عائشہ میں کیوں دفن کیا جائے جس پر یقینی طور پر چھت تھی۔ خصوصیت کے ساتھ امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام اس پر اقدام کیوں کرتے جبکہ وہابیوں کے قول کے مطابق اُنہی کو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کی عمارتوں کو مسمار کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اہل بیت اور صحابہ سب متفق تھے کہ قبر پر عمارت ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۵)

وقتاً فوقتاً روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تجدید واستحکام کی کوشش

وفاء الوفاء سمہودی میں ہے کہ:

''پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حجرے کی چھت پہلے درختِ خرما کی چھال سے بنی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے جس نے اینٹوں والی چھت بنوائی، وہ خلیفہ دوم عمر بن خطاب تھے''۔

اس کے بعد جیسا نووی نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے:

''جب مسلمانوں کی کثرت ہوئی اور صحابہ و تابعین کو مسجد رسول ﷺ کی توسیع کی ضرورت ہوئی اور یہ توسیع ازواج رسول ﷺ کے مکانات تک پہنچ گئی جس میں حجرۂ عائشہؓ بھی تھا تو ان حضرات نے قبر رسول ﷺ کے گرد دائرے کی شکل میں اونچی دیواریں بنوادیں تا کہ قبر مسجد میں اس طرح نمایاں نہ ہو کہ عوام اُس کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھنے لگیں۔ پھر دو دیواریں قبر کے دو شمالی گوشوں سے ملا کر بنائیں تا کہ کوئی قبر کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ ہی نہ سکے''۔

اس سے ظاہر ہے کہ قبر پر یا قبر کے گرد عمارت میں کوئی حرج نہیں۔ بس قبر کی طرف رُخ کر کے نماز نہ ہونا چاہیے۔

اس کے بعد برابر روضۂ رسول ﷺ کی بقاء اور تجدید میں اہتمام ہوتا رہا یہاں تک کہ بخاری نے صحیح میں روایت کی ہے کہ ہشام بن عروہ سے اور انہوں نے اپنے باپ عروہ بن زبیر سے کہ:

''جب ولید بن عبد الملک کے زمانے میں حجرۂ رسول ﷺ کی چار دیواری گر گئی اور اُس کی تعمیر شروع ہوئی تو ایک پیر باہر نکل آیا جس سے یہ خیال کر کے لوگ گھبرا گئے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا قدم مبارک نہ ہو اور کوئی ایسا نہ ملا جو اس کے متعلق اپنی کسی علم کا اظہار کرے۔ بس عروہ بن زبیر نے دیکھ کر کہا کہ یہ بخدا رسول اللہ ﷺ کا پائے مبارک نہیں ہے۔ ہو نہ ہو، یہ عمرؓ کا پیر ہے''۔

اور معلوم ہونا چاہیے کہ ولید کی خلافت ۸۶ھ سے ۹۶ھ تک تھی۔ اس زمانے تک صحابہ میں سے بعض افراد موجود تھے۔

(۶)

زوجۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امّ حبیبہ کی قبر پر عمارت

سمہودی نے لکھا ہے کہ زید بن سائب کی روایت ہے اپنے دادا کی زبانی کہ:

''جب عقیل بن ابی طالبؓ نے اپنے گھر میں ایک کنواں کھدوایا تو ایک منقش پتھر نکلا جس پر لکھا تھا کہ ''یہ امّ حبیبہ دختر صخر بن حرب کی قبر ہے'' تو عقیل نے کنویں کو پٹوا دیا اور اُس پر عمارت بنوا دی۔ ابن سائب کا بیان ہے کہ میں اس عمارت میں داخل ہوا تو میں نے وہ قبر خود دیکھی''۔

(۷)

عماراتِ قبورِ انبیاء بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام

علامۂ معاصر سید ابراہیم راوی رفاعی نے ''اوراق بغدادیہ'' میں لکھا ہے کہ:

''جب مسلمانوں نے شام اور بیت المقدس کو فتح کیا تو انبیاء کی قبروں پر عمارتیں دیکھیں۔ انہوں نے انہیں منہدم نہیں کیا اور سب سے زیادہ مشہور وہ عمارت ہے جو جناب ابراہیم خلیل اللہ کی قبر پر ہے اور اسے خلیفۂ دوم عمر بن خطاب نے دیکھا اور اُسے منہدم نہیں کیا۔ اور شیخ تقی الدین ابن تیمیہ نے اپنی کتاب ''صراط مستقیم'' میں اس عمارت کے وجود کا جناب ابراہیم علیہ السلام کی قبر پر فتوحات کے دور میں ذکر کیا ہے مگر کہا ہے کہ ۴۰۰ھ تک اس عمارت کا دروازہ بند تھا''۔

ہم کہتے ہیں کہ صحابہ کا جن میں خلیفۂ دوم عمر بھی تھے، اس عمارت کو باقی رکھنا اس کی دلیل ہے کہ قبر پر عمارت ہونے میں اُن کے نزدیک کوئی حرج نہیں تھا، اور ابن تیمیہ کا یہ قول کہ

دروازہ اس کا ۳۹۰ھ تک بند تھا، ایک اِدّعا ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں بلکہ تاریخ کا بیان اس کے خلاف ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ چوتھی صدی کے پہلے بھی لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت کو جاتے تھے۔ چنانچہ سیدہ نفیسہ جن کی وفات دوسری صدی ہجری میں ہے، ہر نماز کے بعد دعا کرتی تھیں کہ:

''خداوندا! مجھے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی قبر کی زیارت نصیب کر''۔

اس کا ذکر عثمان بن مدوخ شافعی نے اپنی کتاب ''العدل الشاهد فی تحقیق المشاهد'' میں کیا ہے۔

(۸)

جناب فاطمہ بنتِ اسد کی قبر پر عمارت

گذشتہ شواہد کے بعد ہی عمارتِ قبور کے جواز میں کوئی شک نہیں رہنا چاہیے جبکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل اور تقریر اور پھر اہل بیت اور صحابہ وتابعین کا عمل خیر القرون اور اُس سے ملی ہوئی صدیوں میں برابر جاری رہا اور جو شخص مزید جستجو کرے، اُسے اور زیادہ پتہ چلے گا کہ پہلی ہی صدی میں قبے کی تعمیر ہونے لگی تھی، چنانچہ سمہودی نے وفاء الوفاء میں لکھا ہے کہ:

''فاطمہ بنت اسد (مادر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام) کی قبر کے متعلق عبد العزیز کی روایت ہے، جس کی سند محمد (حنفیہ) ابن علی بن ابی طالب علیہ السلام تک پہنچتی ہے، کہ جب فاطمہ بنت اسد کی حالتِ مرض میں خراب ہوئی اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو فرمایا کہ انتقال ہو فوراً مجھے اطلاع دینا چنانچہ جب ان کی وفات ہوگئی تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی گئی۔ فوراً حضرت تشریف لائے اور اُن کی قبر کھودنے کا حکم دیا اُس مسجد

کے اندر کی زمین پر جسے اب "قبر فاطمہ کہا جاتا ہے"۔

سمہودی کہتے ہیں کہ یہ کہنا جناب محمد حنفیہ کا کہ "اُس مسجد کے اندر کی جگہ میں بتلا رہا ہے کہ اس وقت اُن کی قبر پر مسجد تھی جس میں قبر کا عام طور پر لوگوں کو علم تھا۔ محمد حنفیہ کی وفات ۸۱ھ میں ہے، اس لئے جناب محمد حنفیہ کی یہ روایت بتارہی ہے کہ پہلی ہی صدی میں جناب فاطمہ بنت اسد کی قبر پر مسجد کی تعمیر ہوگئی تھی۔

(۹)

جناب حمزہؓ کی قبر پر عمارت

وفاء الوفاء میں ہے کہ:

"عبد العزیز نے کہا کہ زیادہ گمان ہمارے یہاں یہ ہے کہ مصعب بن عمیر اور عبداللہ بن جحش دفن ہوئے ہیں اُس مسجد کے نیچے جو حمزہؓ کی قبر پر بنی ہوئی تھی"۔

اور یہ عبد العزیز دوسری صدی کے شخص ہیں جس کی صراحت سمہودی نے اس کے پہلے کی ہے اور لکھا ہے کہ آئندہ فصل میں حمزہ کی قبر کے ذکر میں عبد العزیز بن مروان کی زبانی آئے گا کہ قدیم زمانے سے حمزہ کی قبر پر مسجد تھی اور یہ دوسری صدی ہجری کا ذکر ہے۔

(۱۰)

جناب عباسؓ اور امام حسن علیہ السلام کی قبر کا قبہ

علامہ ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں امام محمد باقر علیہ السلام کے حال میں لکھا ہے کہ:

"آپ کی وفات ۱۱۷ھ میں ۵۸ برس کی عمر میں مثل اپنے والد بزرگوار کے زہر سے ہوئی۔ اور آپ کی والدہ اُن کے والد کے چچا امام حسن علیہ السلام

کی بیٹی تھیں اور آپ ماں اور باپ دونوں طرف سے حضرت رسول ﷺ کی اولاد میں ہیں اور آپ بھی اپنے والد کے پاس امام حسن علیہ السلام اور جناب عباس کے قبے میں جو جنت البقیع میں تھا دفن ہوئے''۔

اس سے ظاہر ہے کہ عباس کی قبر پر قبہ ۱۱۷ھ میں موجود تھا اور محدث خواجہ پارسا بخاری نے اپنے کتاب "فصل الخطاب" میں امام زین العابدین کے حال میں لکھا ہے کہ:

''آپ کی وفات مدینے میں ۹۵ھ میں ہوئی اور آپ کی عمر ۵۷ برس کی تھی اور آپ اس قبہ میں دفن ہوئے جس میں عباس اور آپ کے چچا حسن علیہ السلام دفن تھے، پھر اس میں آپ کے فرزند محمد باقر علیہ السلام اور اُن کے فرزند جعفر صادق علیہ السلام دفن ہوئے''۔

اور ابن خلکان نے آپ کے حال میں لکھا ہے کہ:

''آپ کی وفات ۹۴ھ میں ہوئی اور آپ اپنے چچا امام حسن علیہ السلام کے مقبرے میں اس قبے میں دفن ہوئے جس میں عباس کی قبر تھی''۔

اسی طرح امام محمد باقر علیہ السلام کے حال میں لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر میں عباس کی قبر پر قبہ موجود تھا۔

اس کے بعد یہ کہنا کہ ''یہ بدعت تابعین کے بعد پیدا ہوئی ہے''۔ حقیقت امر سے بے خبری یا تجاہل کا نتیجہ ہے بلکہ نجد کے قاضی القضاۃ عبداللہ ابن سلیمان بن بلہید نے اس پر طرہ کر دیا ہے کہ اپنے مضمون میں جو "ام القری" کے شمارہ روز جمعہ ۴ جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ میں شائع ہوا ہے لکھا ہے کہ:

''خیر القرون میں سننے میں نہیں آیا کہ یہ بدعت پیدا ہوئی بلکہ یہ بدعت

پانچ صدیوں کے بعد وجود میں آئی ہے"۔

یہ نہایت عجیب ادعا ہے جسے تاریخ بالکل جھوٹ ثابت کرتی ہے، کیوں کہ تاریخ سے پانچ صدی کے بہت قبل سے قبوں کا وجود آپ کے سامنے آچکا ہے اور سمہودی نے وفاء الوفاء میں لکھا ہے کہ:

"پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر کی عمارت کی دیواریں نیچی تھیں، عبداللہ بن زبیر نے نہایت استحکام کے ساتھ انہیں اونچا کرا دیا۔ پھر ابوالبختری نے جو ہارون رشید کی طرف سے مدینے کا گورنر تھا ۱۹۳ھ میں اس حجرے کی چھت تعمیر کرائی۔ پھر متوکل نے حرمین کے گورنر اسحاق بن سلمہ کو ۲۳۲ھ میں حکم دیا کہ وہ اس حجرے کو سنگ مرمر سے مضبوط بنوا دے"۔

اور ابن خلکان نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے حالات میں خطیب بغدادی سے نقل کیا ہے جو ۴۶۳ھ میں پیدا ہوئے ہیں کہ:

> "موسیٰ کاظم علیہ السلام مقابر شونیزیہ یعنی مقابر قریش میں قبے سے باہر دفن ہوئے اور اُن کی قبر وہاں مشہور ہے اور زیارت گاہ خلق ہے۔ اور اس پر روضہ بنا ہوا ہے اور قندیلیں وہاں آویزاں ہیں اور طرح طرح کے سامان اور بے انتہا فرش فروش ہے"۔

اس میں یہ الفاظ کہ "قبے سے باہر دفن ہوئے" یہ بتاتے ہیں کہ ایک قبہ وہاں آپ کے دفن ہونے سے پہلے موجود تھا اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی وفات ۱۸۳ھ میں ہوئی ہے اور اس وقت مقابر قریش میں قبہ موجود تھا۔ تو زیادہ سے زیادہ اُسے چوتھی صدی ہجری کے درمیان میں ماننا پڑے گا۔

اور جمال الدین ابن عنبہ نے "عمدۃ الطالب" میں لکھا ہے کہ:

"ہارون الرشید نے حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی قبر پر

قبہ تعمیر کرایا تھا"۔

اور ایسا ہی "حبیب السیر اور کامل ابن اثیر وغیرہ میں ہے اور حسین بن حجاج شاعر جن کی وفات ۳۷۲ھ میں ہے، اُن کے ایک قصیدے کا مطلع اس مضمون کا ہے:

"اے نجف میں چمکتے ہوئے قبے والے! جو آپ کی قبر کی زیارت کرے اور شفا طلب کرے، وہ شفا پائے گا"۔

اور ابن خلکان نے ابو تمام حبیب بن اوس طائی (شاعر) کے حالات میں لکھا ہے کہ:

"اُن کی وفات ۲۳۰ھ میں ہوئی اور اُن کی قبر پر نہشل بن حمید طوسی نے قبہ تعمیر کیا"۔

اسی طرح بوران بنت حسن بن سہل کے قبے کا ذکر کیا ہے جن کی وفات ۲۷۱ھ میں ہوئی ہے۔

اسی طرح عضد الدولہ دیلمی کے حال میں لکھا ہے کہ جن کی وفات بھی ۲۷۱ھ میں ہوئی ہے کہ:

"وہ پہلے اپنے گھر میں دفن ہوئے۔ پھر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے حرم کی طرف منتقل کیے گئے جو مقابر قریش میں ہے"۔

ابن وکیع شاعر کے حال میں لکھا ہے کہ جن کی وفات ۳۹۳ھ میں ہوئی ہے کہ:

"وہ بڑے قبرستان میں دفن ہوئے اُس قبے میں جس کی تعمیر وہاں اُن کے لئے ہوئی"۔

اور عثمان بن مدوخ شافعی نے اپنی کتاب "العدل الشاهد فی تحقیق المشاهد" میں سید ابراہیم حسین کے روضے کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"یہ روضہ قاہرہ سے باہر خندق کے قریب ہے اُس کے اور مطریہ کے بیچ

میں اور مسجد تبر الاخشیدی کے نام سے مشہور ہے اس لئے کہ اُنہوں نے اُسے سید ابراہیم مذکور کی قبر پر بنوایا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ تبر اخشیدی کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی"۔

روضۃ الصفا سے پتہ چلتا ہے کہ مامون خلیفہ عباسی نے اپنے باپ ہارون رشید کی قبر پر قبہ بنوایا تھا اور یہ ۲۰۳ھ کے قبل کی بات ہے چنانچہ امام رضاؑ کے حال میں ابوالصلت ہروی کی روایت درج ہے، اُن کا بیان ہے کہ:

"میں ایک دن امام رضاؑ کے پاس تھا۔ آپ نے فرمایا اُس قبے کی طرف جاؤ جس میں ہارون رشید کی قبر ہے اور تھوڑی سے مٹی وہاں کی لے آؤ۔ اُن کا بیان ہے کہ میں گیا اور لے آیا تو آپ نے اُسے سونگھا اور پھر پھینک دیا۔ فرمایا بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ میرے لئے وہیں قبر کھودی جائے"۔

سب کو معلوم ہے کہ یہ خلیفہ مامون العباسی خود اہل علم میں سے تھا جیسا کہ سیوطی کی تاریخ خلفاء میں ہے کہ مامون عدل و انصاف کا پابند، علم فقہ کا ماہر اور بڑے علماء میں اس کا شمار تھا۔ پھر دوسرے علماء بھی اس زمانے میں بہ کثرت موجود تھے جن میں امام شافعی، احمد بن حنبل اور سفیان بن عینیہ ایسے لوگ تھے مگر کسی نے قبے کی تعمیر میں اظہار اختلاف نہیں کیا۔

اس مختصر کتاب میں اتنے شواہد کا درج کرنا کافی ہے۔ جو شخص پورے طور پر تلاش کرے اُس کو مزید شواہد اس کے بکثرت ملیں گے۔

اجماع، یہاں ہم اس اصطلاح کے مطابق اُسے دیکھیں گے جو اہل سنت کی ہے۔ یعنی مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت کا اتفاقِ رائے۔ یہ قبور کی تعمیر کی موافقت اور مسلمانوں کی رائے عامہ ان عمارتوں کے بقاء اور احترام پر متفق رہی۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے جسے حافظ جلال

الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ جب متوکل نے امام حسین علیہ السلام کے روضے کو منہدم کرایا اور اس سے بھی یہ ظاہر ہے کہ تیسری صدی میں آپ کی قبر پر عمارت تھی اور اس کے گرد اور بھی عمارتیں تھیں جنہیں متوکل نے منہدم کرا کے کھیتی کرا دی اور لوگوں کو زیارت سے روک دیا اور متوکل کا ناصبی یعنی دشمن اہل بیت ہونا عام طور پر مشہور تھا تو مسلمانوں کو اس سے بڑا صدمہ پہنچا اور بغداد کے باشندوں نے اُس کے خلاف نعرے دیواروں پر لکھ دیے اور شعراء نے اُس کی مذمت میں اشعار کہے جن میں سے بعض سیوطی نے نقل بھی کئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ عام مسلمان جنہیں ''جمہور اُمت'' کہنا چاہیے، اس عمارت کے احترام میں متفق تھے۔

اور اکثر علماء نے اس کے مطابق تصریح کی ہے چنانچہ صاحب در المختار نے لکھا ہے کہ:

''عمارت بنانے میں اختلاف ہے۔ ہمارا مختار یہ ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں''۔

اور ملا علی قاری نے شرح مشکوۃ میں لکھا ہے کہ:

''سلف صالحین نے مستحسن سمجھا ہے عمارت بنانے کو مشائخ اور مشہور علماء کی قبروں پر تا کہ لوگ ان کی زیارت کو جائیں اور ان عمارتوں میں ٹھہر کر آرام پائیں''۔

اور ایسا ہی محدث محمد طاہر فتنی نے مجمع البحار میں لکھا ہے اور دوسرے علماء کے اقوال بھی اسی کے مطابق ہیں۔

اس کے بعد علمائے مدینہ کا یہ قول غلط ہو جاتا ہے کہ قبور پر عمارت بنانا اجماعاً ممنوع ہے اس لئے کہ وہ احادیث جو اسے روکتے ہیں صحیح السند نہیں مگر معلوم ہو گیا کہ اجماع اور اُن احادیث کا ادعا بالکل بے بنیاد ہے۔

اُن کا یہ کہنا کہ اکثر علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ ان عمارتوں کا منہدم کرنا واجب ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کی حدیث کی بناء پر کہ آپ نے ابوالہیاج سے یوں فرمایا۔ ہم جہاں تک کتابوں پر نظر ڈالتے ہیں، ہمیں یہ علماء نظر نہیں آتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام علماء صرف نجد کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی ہر زمانے کے علماء تو تمام تیرہ صدیوں میں ان عمارتوں کو دیکھتے رہے اور کبھی اُن کے منہدم کرنے کا فتویٰ نہیں دیا، سوا ابن تیمیہ اور ابن قیم جو جمہور علماء کی مخالفت کا نشانہ رہے اور سوائے زمانہ ہوئے۔ اس کے برخلاف تمام علماء کے سکوت اور تائید کے ساتھ تمام مسلمان ان عمارتوں کی تجدید اور استحکام کی طرف متوجہ رہے۔

ابوالہیاج والی حدیث سے جو یہ لوگ استفادہ کرتے ہیں، وہ باطل ہے کئی وجوہ سے۔

اول یہ کہ یہ حدیث کفار و مشرکین کے قبور سے متعلق ہے جن کے وجود سے کوئی دینی فائدہ نہیں بلکہ مضرت کا اندیشہ ہے۔ لیکن انبیاء و صالحین کے قبور کی بقاء میں دینی فوائد ہیں جو پسندیدۂ خالق ہیں جیسے زیارت ان قبور کی جس کے لئے حکم بھی ہوا ہے کہ قبروں کی جا کر زیارت کرو کہ اُن سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے اور پھر اُن کارناموں کی یاد تازہ ہوتی ہے جو ان حضرات نے اشاعتِ دین اور خدا کی راہ میں کئے تھے اور قبور کفار سے اس حدیث کے تعلق ہونے کا قرینہ خود حدیث میں موجود ہے، اس لئے کہ ایک ساتھ دو چیزوں کے محو کرنے کا حکم ہوا۔ ایک مورتیاں اور دوسری اونچی قبریں اور ظاہر ہے کہ یہ مورتیاں مسلمانوں کی تعمیر کردہ نہیں تھیں بلکہ مشرکین کی تیار کردہ تھیں تو یہ قبریں بھی اُنہی کی ہوں گی۔ اور یہ درایۃً بھی ظاہر ہے کیونکہ مسلمان اُس دور میں مالی حیثیت سے کہاں اتنے مطمئن تھے کہ وہ قبروں پر عمارتیں تعمیر کراتے اور صحابہ صرف صحبت کے لحاظ سے سب برابر کی حیثیت رکھتے تھے لہٰذا ان میں کچھ افراد کو ایسی امتیازی خصوصیت حاصل نہ تھی کہ ان کی قبر پر عمارت تعمیر ہوتی۔ لہٰذا وہ قبور جن کے مٹانے کا حکم ہوا تھا ہرگز مسلمانوں کی قبریں نہ تھیں، ورنہ اُن پر سابق خلفاء کے دور میں عمارتیں کیوں تعمیر ہوتیں جواب جناب امیر علیہ السلام کو اُن کے منہدم

کرانے کی ضرورت ہوتی۔ اور پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کا آپ نے حوالہ دیا کہ مجھے اس مہم کے لئے بھیجا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں مومنین کے قبور پر یہ عمارتیں کیونکر بن گئیں اور خود حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بوقت تعمیر خبر نہ ہوئی جو بعد میں اُن کے گرانے کے لئے حضرت علی علیہ السلام کو بھیجا؟

اب یہ کہ وہ انبیاء سلف کی قبریں ہوں تو ایسا بھی نہیں تھا۔ ایک تو وہ مدینہ اور اُس کے اطراف میں نہ تھیں بلکہ شام وفلسطین وغیرہ میں تھیں یا عراق میں تھیں اور پھر اگر ان قبروں کے انہدام کو بھیجا تھا تو وہ بعد میں باقی کیونکر رہیں جو تمام اطراف ارض میں منتشر ہیں جیسے جناب دانیال علیہ السلام کی قبر شوستر میں اور جناب ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام اور جناب یونس علیہ السلام اور ذی الکفل علیہ السلام اور یوشع علیہ السلام کے قبور نجف اور سرزمین بابل میں اور بہت سے انبیاء کے قبور شام اور فلسطین میں۔

اور سنیئے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مادر گرامی جناب آمنہ بنت وہب کی وفات کب ہوئی تھی؟ جب حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک ۶ برس کی تھی اور چالیس برس کی عمر میں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث برسالت ہوئے یہ چونتیس ہو گئے۔ پھر تیرہ برس کے بعد ہجرت ہوئی۔ اب ہوئے سینتالیس برس۔ پھر ۸ ھ میں فتح مکہ ہوئی۔ یہ پچپن برس یعنی آدھی صدی سے زیادہ کا زمانہ گزر گیا اور اُس وقت تک جناب آمنہ کی قبر نمایاں تھی۔ مگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے گرانے یا مٹانے کا حکم نہیں دیا بلکہ خالق سے اُن کی قبر کی زیارت کے لئے اجازت حاصل فرمائی اور خداوند عالم نے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی اجازت دی اور آپ کچھ اصحاب کی معیت میں وہاں زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔ سرہانے بیٹھے اور سر مبارک کو اس طرح جنبش دے رہے تھے جیسے کچھ باتیں کر رہے ہوں اور پھر گریہ فرمایا جس پر تمام حاضر الوقت مسلمان جو سب صحابہ تھے گریہ کرنے لگے۔ اس کا ذکر صحیح مسلم میں بھی موجود ہے۔

پھر اس کا بھی ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند جناب ابراہیم کی قبر بھی

مکان کے اندر تھی اور وہ قبر خود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوائی تھی۔ یہ مکان بھی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور اس کے بعد برابر باقی رہا۔

اس کے بعد خود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک عمارت کے اندر ہوئی جسے خود حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام اور دیگر اہل بیت اور صحابہ نے بنوایا اور وہ عمارت بھی برابر باقی رہی بلکہ اُس کے استحکام اور عمارت کی شان میں میں اضافہ کیا جاتا رہا اور اس کے بعد جناب عباس عم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر قبے کی تعمیر بھی اسی دور میں ہوئی جو حضرت امیر علیہ السلام کے دور حکومت کے قبل کا تھا اور یہ قبہ بھی اس کے پہلے اور اس کے برابر قائم رہا۔

اس سب سے ظاہر ہے کہ یہ منہدم کرنے کا حکم اگر تھا تو وہ قطعاً کفار و مشرکین کے قبور سے متعلق تھا اور مقربین و صالحین کے قبور میں امتیاز خاص ہو تا مر تکزات نفوسِ اہل اسلام میں سے تھا چنانچہ اصابہ حافظ ابن حجر میں محمد بن شرجیل کے حال میں ہے کہ خود اُن کا بیان ہے کہ:

"میں نے سعد بن معاذ کی قبر کی تھوڑی سی خاک مٹھی میں لے کر سونگھی تو اس میں سے مشک کی خوشبو محسوس کی"۔

اب جبکہ وہ حکم انہدام درصورت یہ کہ اس حدیث کے معنی یہی ہوں، کفار اور مشرکین کے قبور سے متعلق تھا تو اُس سے ائمہ دین اور مومنین و صالحین کے قبور کے انہدام پر استدلال کرنا بالکل غلط ہے۔

دوسری بات یہ کہ "جو قبر اونچی دیکھو، اُسے برابر کر دو" اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ خود قبر اونچی ہو جیسے عیسائیوں کی قبریں ہوتی ہیں یا خود مسلمانوں کے ایک طبقے میں کوہان شتر کی طرح اوپر اٹھی ہوئی قبریں بنائی جاتی ہیں تو اُن قبروں کو اوپر سے منہدم کر کے برابر کر دینے کا حکم ہو۔ لہٰذا اس حکم کی زد اُن قبروں پر نہیں پڑتی جو مسطح بنائی گئی ہوں لیکن ان کے گرد عمارت بنا دی گئی ہو یا قبے کی تعمیر کی گئی ہو۔ جیسا کہ ائمہ دین اور صالحین و مقربین کے قبور ہوتے ہیں حدیث کا تعلق اُن قبور سے

نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود قبور کی ساخت میں اختلاف ہے۔ اہل سنت کی اکثریت کوہان شتر کی طرح اونچی بناتی ہے لیکن فقہ امامیہ میں جس کی بناو پر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے تعلیمات پر قائم ہے جو اپنے جد بزرگوار حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہنچائے ہوئے شرع الٰہی کے احکام سے زیادہ واقف تھے اور نیز فقہ شافعی میں قبر کو مسطح بنانا چاہیے۔ یہ حدیث اس سے متعلق ہے۔ اس لئے ہمارے ایک بڑے محدث شیخ حر عاملی علیہ الرحمہ نے حدیث کی اپنی بڑی مبسوط کتاب "وسائل الشیعہ" میں اُسے "تسطیح قبر" کے باب میں درج کیا ہے اور محدث نووی نے بھی جو بڑے علماء اہل سنت میں سے ہیں یہی مطلب سمجھا ہے، چنانچہ شرح صحیح مسلم میں اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ:

"سنت یہ ہے کہ قبر زمین سے زیادہ اونچی نہ ہو اور اُسے کوہان شتر کی طرح کا نہ بنایا جائے بلکہ بس ایک بالشت اونچی رکھی جائے اور یہی شافعی اور اُن کے ہم خیال علماء کا مسلک ہے"۔

اور قسطلانی نے بھی شرح صحیح بخاری میں اُسے قبروں کے مسطح بنانے کے دلائل میں درج کیا ہے اور کہا ہے کہ اُس حدیث میں قبور کے برابر کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اُنہیں زمین کے برابر کر دیا جائے بلکہ اُس کا مطلب یہی ہے کہ اُنہیں مسطح کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ سوتیہ کی لفظ جو تسویۃ سے ہے، اس کے ساتھ اگر کسی چیز کا نام لیا جائے تو معنی اُس شے سے برابر کرنے کے ہوں گے لیکن جب کسی دوسری چیز کا نام نہ لیا جائے تو اُس کے معنی یہ ہوں گے کہ بس اپنی جگہ اُس شے کو معتدل اور مسطح بنا دیا جائے چنانچہ فیومی نے مصباح المنیر میں لکھا ہے کہ استوی المکان کے معنی یہ ہیں کہ یہ جگہ معتدل و متوازن ہو گئی اور سویتہ کے معنی ہیں کہ میں نے اُسے معتدل و متوازن بنا دیا اسی طرح قاموس میں

ہے۔ اگر وہ معنی ہوتے تو سویتہ بالارض کہا جاتا جیسے قاموس نے کہا ہے کہ سویتہ بہ تسریۃ اور سویت بینھما اور ساویت او اسریتہ بہ، اس سب کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اس کو اس دوسرے کے برابر کر دیا۔ یہاں صرف سویتہ ہے تو اس کے معنی وہی ہیں کہ جو علماء نے سمجھے ہیں کہ قبر کی بیچ والی اونچائی کو ختم کر کے اُسے مسطح کر دیا جائے۔

اگر قبر کو زمین کے بالکل برابر کرنے کا حکم ہوتا تو پیغمبر خدا ﷺ نے عثمان بن مظعون کی قبر کو زمین سے ذرا اونچا کیوں رکھا جس کی صراحت حدیث میں موجود ہے۔ اور ایک حدیث ابھی آئے گی جس میں ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ قبر سے تکیہ لگائے بیٹھا ہے اور تکیہ لگنا ممکن ہی نہیں جب تک قبر زمین سے کچھ نہ کچھ اونچی نہ ہو۔

اس تعمیر کے شعبے سے متعلق ایک چیز ہے قبر پر سایہ کرنا جس کی ممانعت بھی کچھ وہابی افراد کی زبانی گوش زد ہوئی ہے حالانکہ اس کا بھی وقوع اُسی دور میں جو خیر القرون تھا نظر آیا ہے۔ چنانچہ اصابہ حافظ ابن حجر میں ثعلبہ بن مالک کی روایت ہے کہ:

> ''حکم ابن ابی العاص کی دور خلافت عثمان میں موت ہو گئی اور گرمی اس دن شدت سے تھی تو قبر پر ایک خیمہ نصب کیا گیا۔ کچھ لوگوں نے اس پر ''چہ می گوئی'' کرنا شروع کی تو جناب عثمان نے کہا کہ عمر کے زمانے میں زینب بنت جحش کی قبر پر خیمہ لگایا گیا تو اس وقت کسی نے اعتراض نہیں کیا''۔
>
> حکم کی موت ۳۲ھ میں ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ تفسیر روح المعانی میں ہے کہ جناب محمد حنفیہؒ نے جناب ابن عباسؓ کی قبر پر خیمہ لگوایا اور صحیح بخاری میں ہے کہ جب حسن بن حسن علیہ السلام کی وفات ہوئی تو اُن کی زوجہ مکرمہ (فاطمہ بنت الحسین علیہا السلام) نے اُن کی قبر پر خیمہ نصب کیا اور وہاں ایک سال قیام کیا۔

یہ کہنا کہ ''قبروں کو مسجد بنانا اور اُن میں نماز، یہ بھی ممنوع ہے'' اس کا مستند شاید رسول

خدا ﷺ کی یہ حدیث ہو کہ اللہ یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنایا مگر اس حدیث کا صحیح مطلب وہ ہے جسے محدث طاہر فتنی نے مجمع البحار میں لکھا ہے کہ:

''وہ لوگ ان قبروں کو قبلہ بنا کر اُن کی طرف ہر نماز میں مثل بتوں کے سجدہ کرتے تھے''۔

اور حافظ سیوطی نے اپنی کتاب ''زہر الربی'' میں اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ:

''جب ان میں کوئی نیک آدمی مرتا تھا تو اس کی قبر پر مسجد بناتے تھے''۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ:

''چونکہ یہود و نصاریٰ اپنے پیغمبروں کی قبروں کا سجدہ کرتے تھے اور انہیں قبلہ بنا کر اُن کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور انہیں بت بنا لیا تھا اس لئے اُن پر لعنت کی گئی اور مسلمانوں کو روکا گیا کہ وہ ایسا نہ کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی نیک آدمی کی قبر کے پاس مسجد بنائے صرف حصولِ برکت کے لئے اور اس کی طرف رُخ کر کے نماز نہ پڑھے تو وہ اس میں داخل نہ ہوگا''۔

علامہ سندی مدنی حاشیۂ سنن نسائی میں لکھتے ہیں کہ:

''حضرت ﷺ کا مقصود یہ تھا کہ اپنی اُمت کو ڈرائیں اُس سے جو یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کے ساتھ کیا تھا کہ انہیں مسجد بنا لیا تھا تو اس طرح کہ اُنہی کو سجدہ کرنے لگے یا انہیں قبلہ بنا لیا کہ نماز وغیرہ میں اُنہی کی طرف رُخ کرنے لگے۔ لیکن اگر جوارِ قبر میں حصولِ قبر کے لئے مسجد بنائے تو وہ ممنوع نہیں ہے''۔

پہلے اسی کتاب میں قبر پر مسجد کی تعمیر کے شواہد درج ہو چکے ہیں جیسے اصحابِ کہف پر مسجد کی تعمیر اور فاطمہ بنت اسد کی قبر پر مسجد کا جناب محمد حنفیہ کے سامنے وجود اور دوسری صدی میں

جناب حمزہ کی قبر پر مسجد کا موجود ہونا اور یہاں مزید اضافہ اس پر یہ ہے کہ "کنوز الحقائق مناری" میں دیلمی کی روایت ہے کہ:

''مسجد خیف میں ستر نبی دفن ہیں''۔

اور ایک مقام پر اس کی روایت طبرانی سے ہے۔ اس سے ابن قیم کے اس دعوے کی رد ہو جاتی ہے کہ دین اسلام میں مسجد اور قبر یکجا نہیں ہو سکتے بلکہ جو بعد میں ہو، اُسے روک دیا جائے اور پہلے والے کو باقی رکھا جائے اور سب سے بڑی مثال دونوں کے یکجا ہونے کی مسجد الحرام ہے جس کے اندر حجر اسمٰعیل میں جناب اسمٰعیل اور ہاجرہ کی قبر کا وجود ہے۔

ایک اور معنی اُس حدیث کے یہود اور نصاریٰ نے اپنے انبیاء کے قبور کو مسجد بنالیا، وہ ہیں جو امام بخاری نے سمجھے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ یہود اور نصاریٰ نے اپنے انبیاء کے قبور کو کھود ڈالا اور اُن کی جگہ پر مسجدیں بنا دیں تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن پر لعنت کی ہے پیغمبروں کی توہین کی وجہ سے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنی صحیح میں عنوان قائم کیا ہے کہ مشرکین جاہلیت کی قبروں کو کھود ڈالا جائے اور ان کی جگہ پر مسجدیں بنادی جائیں، اس کے ثبوت میں انہوں نے یہ حدیث درج کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود و نصاریٰ پر لعنت کی اس بات پر کہ اُنہوں نے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنایا۔ صاحب فتح الباری نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ:

''اس حدیث سے کفار کے قبور کو مسجد بنانے پر استدلال اس بناء پر ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن پر لعنت فرمائی جنہوں نے انبیاء کے قبور کو مسجد بنایا اور انبیاء کے ساتھ اس حکم میں اُن کے تابعین شریک ہیں جو مومنین صالحین ہیں۔ لیکن دوسرے لوگ یعنی مشرکین، اُن کے قبرستانوں کو کھود کر مسجد بنایا جا سکتا ہے''۔

حدیث کا یہ مفہوم ہو تو وہ وہابی نقطہ نظر کے بالکل خلاف ہے، اس لئے انبیاء کے

قبرستانوں کو کھود کر مسجد بنانے پر لعنت جب انبیاء کی توہین کی بناء پر ہوئی ہے تو بغیر مسجد بنائے ہوئے بلا وجہ بلکہ بطور ظلم وفساد اُن کے مقبروں کا کھودنا جو یقیناً اُن کی توہین ہے، کیونکر مورد لعنت نہ ہوگا؟

مقبروں میں نماز، اس کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ جمہور علماء کراہت کے قائل ہیں۔ وہابیوں کا جو نقطۂ نظر ہے۔ اُس کے خلاف اہل بیت کرام اور صحابہ کا عمل موجود ہے، چنانچہ غزالی نے احیاء العلوم میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت لکھی ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا جناب حمزہؓ کی قبر کی زیارت کرنے جاتی تھیں اور وہاں نماز پڑھتی تھیں اور روتی تھیں۔ اس کے علاوہ حجر اسمٰعیل میں جناب اسماعیل اور ہاجرہ کی قبروں کے ہوتے ہوئے، وہاں نماز کی فضیلت وارد ہوئی ہے اور ابن اثیر نے نہایہ میں لکھا ہے کہ:

"مقبروں میں نماز سے ممانعت اس لئے ہوئی ہے کہ وہاں کی خاک میں اکثر مردوں کے جسم سے نکلی ہوئی رطوبتیں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ ورنہ اگر کسی پاک صاف جگہ نماز پڑھے تو کوئی حرج نہیں ہے"۔

ایسا ہی محدث فتنی نے "مجمع البحار" میں لکھا ہے اور اتنا اضافہ کیا ہے کہ:

"یہ ممانعت مخصوص ہے اُن قبروں سے جو کھدی ہوئی ہوں"۔

اس کے علاوہ قبروں کے پاس نماز کی ممانعت میں اگر اس حدیث سے استدلال کیا جائے کہ قبروں کو مسجد نہیں بنانا چاہیے تو اس کے مفہوم پر کافی بحث ہو چکی ہے اور اس کا ثبوت ابن حبان کی صحیح سے بھی ہوتا ہے کہ اُس میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کی طرف نماز پڑھنے سے ممانعت فرمائی ہے اور امام احمد بن حنبل نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا قبروں پر بیٹھو نہیں اور قبروں کی طرف نماز نہ پڑھو۔

اس کے بعد اُن احادیث کے مفہوم میں شک وشبہ باقی نہیں رہتا اور نیک اعمال افراد کی قبروں کے پاس نماز حصولِ برکت کے لئے برابر سلف صالحین میں جاری وساری رہی جس کی

تقویت اس حکم قرآنی سے ہوتی ہے کہ

''ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو اپنی نماز کا محل بناؤ''۔

اور عبد اللہ بن عمر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار کی جستجو کرتے تھے اور وہاں نماز پڑھتے تھے اور ابن تیمیہ حنبلی نے ''صراط مستقیم'' میں لکھا ہے جیسا کہ ''اوراق بغدادیہ'' میں نقل ہوا ہے کہ سندی خوارزمی کا بیان ہے کہ:

''ہم نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ کوئی شخص ان متبرک مقامات پر جو بنے ہوئے ہیں جائے، اس باب میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ انہوں نے کہا ابن ام مکتوم کی حدیث ہے، انہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ وہ اپنے گھر میں نماز پڑھا کریں کہ وہ ایک مرکز نماز کا ہو جائے اور ابن عمر کا عمل کہ وہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ٹھہرنے کے مقامات پر جا کر نمازیں پڑھتے تھے، ان دونوں روایتوں کی بناء پر ان متبرک مقامات پر بھی جا کر نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر لوگوں نے اس میں افراط سے بہت کام لیا ہے اور اس میں بہت زیادتی کر دی ہے''۔

اسی طرح احمد بن قاسم نے اُن سے نقل کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا ان مقامات متبرکہ پر جانے کے متعلق جو مدینۂ طیبہ میں ہیں تو اُنہوں نے کہا کہ:

''ابن مکتوم کی حدیث اور عبد اللہ ابن عمر کے عمل کی بناء پر جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لے جانے کے مقامات پر نمازیں پڑھتے تھے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اُس کی اجازت ہے''۔

کتاب ''الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام'' میں جناب خدیجہ علیہا السلام کے مکان کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اُسے عقیل بن ابی طالب نے لے لیا، پھر اُن سے معاویہ بن

ابی سفیان نے خرید ااور اُسے مسجد بنا دیا کہ اس میں نماز پڑھی جائے۔

معلوم ہوا کہ انبیاء اور صالحین کے روضوں پر نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے اور اس کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ سیرت اسلاف صالحین اُس کے استحسان کا پتہ دیتی ہے"۔

یہ کہنا کہ چراغ جلانا قبروں پر ممنوع ہے ابن عباسؓ کی روایت کی بناء پر کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی قبروں پر زیارت کرنے والیوں اور انہیں مسجد بنانے والوں اور چراغ جلانے والوں پر، اس کے متعلق عرض ہے کہ چراغ جلانا اگر بغیر کسی صحیح مقصد کے ہو تو اس کی ممانعت ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ زائرین کی سہولت اور تلاوتِ قرآن کرنے والوں، اُدعیہ و زیارات پڑھنے والوں کے لئے ہے تو وہ اعانت علی الخیر ہے۔ ان پر ہرگز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت متوجہ نہیں ہو سکتی اور زیارت قبور والی ممانعت کے متعلق تحفة البارى اور ارشاد السارى وغیرہ میں ہے کہ وہ بعد میں منسوخ ہوگئی اور قبور کے مسجد بنانے کے مفہوم پر بحث پہلے ہو چکی ہے۔ تمسح اور دُعا کے بارے میں شواہد بھی پہلے آچکے ہیں۔ مزید برآں یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے "صراط مستقیم" میں لکھا ہے کہ ابوبکر اثرم نے روایت کی ہے کہ:

"میں نے احمد بن حنبل سے قبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمسح کے بارے میں پوچھا۔ اُنہوں نے کہا مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں۔ پھر منبر کے لئے دریافت کیا، انہوں نے کہا اس کے لئے روایت آئی ہے کہ عبداللہ بن عمر منبر سے تمسح کرتے تھے اور سعید بن مسیب کا عمل بھی بیان ہوا ہے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ امام احمد بن حنبل نے بھی قبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ جرأت نہیں کی کہ اُس سے تمسح کو حرام قرار دیں۔ بس اپنی لاعلمی کا اظہار کیا حالانکہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب منبر سے تمسح کا شاہد مل گیا تو قبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو منبر سے زیادہ قابل احترام ہے او قبر کے بارے میں جو ان کا قول بیان کیا گیا ہے کہ مجھے اُس کے متعلق علم نہیں ہے، یہ بظاہر اس راوی کا سہو ہے یا

یہ کہ یہ شخص قابلِ اعتماد نہ تھا، اس لیے امام احمد نے اُس سے کھل کر گفتگو نہیں کی۔ اس لئے کہ جیسا علامہ سید حسن صدر طاب ثراہ نے اپنے رسالے میں نقل کیا ہے امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبداللہ بن احمد نے جن کا قول ظاہر ہے کہ اپنے والد کے بارے میں زیادہ معتبر ہے، "کتاب العدل والسوالات" میں لکھا ہے کہ:

"میں نے اپنے والد سے اس شخص کے متعلق پوچھا جو منبر رسول ﷺ کو تبرکاً چھوئے اور اُس کا بوسہ لے اور ایسا ہی قبر مبارک کے ساتھ کرے اس امید میں کہ اُسے ثواب ملے گا، انہوں نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے"۔

نیز ابن تیمیہ نے یحییٰ بن سعید کی روایت درج کی ہے کہ جب وہ عراق کی طرف جانے لگے تو منبر رسول ﷺ کی طرف آئے اور اُسے ہاتھ سے چھوا اور دعا مانگی۔ اور امام مالک سے نقل ہوا ہے کہ وہ منبر رسول ﷺ سے برکت حاصل کرتے تھے اور سبکی نے کہا ہے کہ قبر رسول ﷺ سے تمسح سے ممانعت پر کوئی اجماع نہیں ہے۔ اور اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ مروان بن حکم نے دیکھا کہ ایک شخص قبر رسول ﷺ سے لپٹا ہوا ہے تو مروان نے اُس کی گردن پکڑی اور کہا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اُس نے کہا کہ میں پتھروں اور اینٹوں کی طرف نہیں آیا ہوں۔ میں رسول ﷺ کی خدمت میں آیا ہوں اور یہ شخص جناب ابو ایوب انصاری تھے اور ایسا ہی بلال موذن رسول ﷺ کے متعلق آیا ہے کہ انہوں نے اپنا منہ قبر رسول ﷺ کی مٹی سے ملا اور یہ عمل صدرِ اسلام سے برابر مسلمانوں میں رائج رہا۔

ذبح اور نذر بے شک اگر خدا کا نام لے کر نہ ہو اور قصدِ قربتِ الٰہی نہ ہو تو ہم بھی اُس ذبح کو حلال نہیں سمجھیں گے۔ اور نہ نذر کو درست سمجھیں گے لیکن اگر اللہ کا نام لے کر کسی روضے کے زائروں میں تقسیم کرنے کے لئے ذبح کرے تو اس میں کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی اور اسی طرح اگر اللہ سے نذر کرے اُس روضے کے زائرین کی کچھ خدمت کے متعلق تو اس کے بھی حرام ہونے

کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

یہ کہنا کہ دعا کے وقت روضۂ رسول ﷺ کی طرف رُخ کرنے کو روکنا بہتر ہے اور تمام سمتوں میں سب سے افضل سمت قبلہ ہے، یہ پیغمبر خدا ﷺ کے مرتبے سے ناواقفیت، یا چشم پوشی کا نتیجہ ہے۔

رسول خدا ﷺ کے بارے میں جو صحیح العقیدہ علماء ہیں جیسے علی بن برہان الدین شافعی "انسان العیون" اور حافظ جلال الدین سیوطی "خصائص کبری" میں صراحۃً لکھتے ہیں کہ:

"قبر رسول ﷺ کی سرزمین اجماعاً تمام قطعاتِ ارض یہاں تک کہ کعبے کی زمین سے بھی افضل ہے اور بعض نے کہا ہے کہ آسمان کے بھی ہر مقام یہاں تک کہ عرش سے بھی افضل ہے"۔

اور توسّل کی بحث میں قاضی عیاض کی روایت آچکی ہے کہ منصور دوانیقی نے امام مالک سے پوچھا کہ میں قبلہ رُخ دعا مانگوں کہ قبر رسول ﷺ کی طرف رُخ کرکے؟ تو انہوں نے کہا کہ:

"اپنا چہرہ آپ رسول خدا ﷺ کی طرف سے کیوں موڑیے حالانکہ وہ آپ کا بھی وسیلہ ہیں اور آپ کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا بھی وسیلہ ہیں"۔

اور علامہ محقق کمال بن ہمام نے صراحۃً کہا ہے کہ:

"قبر شریف کی طرف رُخ کرنا قبلہ کی طرف رُخ کرنے سے افضل ہے"۔

اور علامۂ ابن حجر مکی نے "جوہر منظم" میں اس پر یہ دلیل قائم کی ہے کہ ہم سب متفق ہیں اس امر پر کہ:

"حضرت ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں اور حضرت ﷺ اگر ہماری

آنکھوں نے سامنے زندہ بیٹھے ہوتے تو آپ کے پاس ملاقات کے لئے آنے والا لازماً آپ کی طرف رخ اور قبلے کی طرف پشت کرتا تو ایسا ہی حضرت ﷺ کی قبر کی زیارت کے وقت ہونا چاہیے"۔

طواف اور تمسح اور بوسہ لینے کے لئے جو کچھ کہا گیا ہے، اس پر بحث پہلی آچکی ہے اور عبداللہ بن احمد بن حنبل کی زبانی خود امام احمد بن حنبل جن کی طرف ابن عبدالوہاب اور تمام مجدی حضرات اور اُن کے مقتدایان ابن تیمیہ اور ابن قیم سب کا انتساب ہے، ان کا ارشاد آچکا ہے کہ قبر رسول ﷺ کا بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ موت کے بعد قبر کا بوسہ لینا ویسا ہی ہے جیسے زندگی میں ہاتھوں یا پیروں کا بوسہ لینا۔ کیونکہ معیار دونوں کا ایک ہی ہے اور وہ عزت و احترام ہے۔ اور سنن ابوداؤد میں عبداللہ بن عمر کی زبانی ہے کہ ہم لوگ رسول ﷺ کے پاس گئے اور آپ کے ہاتھوں کا بوسہ لیا اور امّ ابان بنت وازع بن زارع کی روایت ہے اپنے دادا زارع سے جو قبیلہ عبدالقیس کے وفد میں آئے تھے کہ جب ہم پہنچے تو اپنے مرکبوں سے جلدی جلدی اتر کے رسول ﷺ کے ہاتھوں اور پیروں کا بوسہ لے رہے تھے۔ اس کے علاوہ تعظیم رسول ﷺ کے سلسلے میں بوسہ لینے کے دوسرے شواہد بھی پہلے آچکے ہیں۔

اب بحمد اللہ

علمائے مدینہ کی طرف منسوب شدہ فتوے کے تمام اجزاء کے پرخچے اُڑ چکے ہیں اور ثابت ہو گیا ہے کہ قبور پر قبوں کی تعمیر اور اُن کے تعظیم و توقیر کے حرام یا شرک ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ سیرت رسول ﷺ، سیرت صحابہ و تابعین اور تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے جو شروع سے اب تک رہا، جو ان عمارتوں کو منہدم کرے یا اس انہدام کا حامی ہو، وہ باصطلاح اہل سنت خارج از جماعت ہونے کی وجہ سے خارج از دین ہے۔

چھٹا باب

کچھ احادیث اور اخبار جو اہل نجد کے بارے میں ہیں

منجملہ اُن کے صحیح بخاری میں حضرت پیغمبر خدا ﷺ کے لئے وارد ہے کہ:

''حضرت ﷺ منبر کے پہلو میں کھڑے ہوئے اور فرمایا ادھر فتنہ ہوگا جہاں سے شیطان کا سینگ برآمد ہوگا''۔

یا فرمایا کہ:

''سورج کی شعاع برآمد ہوتی ہے''۔

دوسرے لفظوں میں تو بالکل صاف ہے کہ حضرت ﷺ کا ارشاد مشرق کی طرف تھا، ہاں پہلی صورت میں الفاظ حدیث کے مبہم ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت ﷺ کا اشارہ کس طرح تھا؟ مگر اس کی تشریح دوسری حدیث سے ہو جاتی ہے جو عبداللہ بن عمر سے ہے کہ انہوں نے رسول خدا ﷺ کو سنا جبکہ آپ مشرق کی طرف رُخ کیے ہوئے تھے کہ آپ فرمارہے تھے معلوم ہونا چاہیے کہ فتنہ اُدھر سے اُٹھے گا جدھر شیطان کا سینگ ہے۔ اس سے پتہ چل گیا کہ حضرت ﷺ کا اشارہ مشرق کی طرف تھا اور یہ سب کو معلوم ہے کہ مدینے سے مشرق کی طرف سرزمین نجد ہے۔

دوسری حدیث صحیح مسلم میں ہے کہ:

''دلوں کی سختی اور بے وفائی مشرق میں ہے اور ایمان اہلِ حجاز میں ہے''۔

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حدیثوں میں صاف بتا دیا کہ اہلِ حجاز نسبتاً صاحب ایمان ہوتے ہیں اور نجد کے لوگ سخت دل اور بے رحم ہوتے ہیں مگر ان وہابیوں نے الٹا حکم لگا دیا ہے کہ نجدی ہی صرف صاحبانِ ایمان ہیں اور اہلِ حجاز اور تمام دنیا کے مسلمان کافر و مشرک ہیں۔ پھر اگر کسی کو شک رہے اس میں کہ مشرق سے مراد نجد ہے بلکہ خیال کرتا ہو کہ کوئی اور ملک مراد ہے تو ایک اور حدیث میں جو صحیح بخاری میں ہے اس اجمال کو بالکل دور کر دیا گیا ہے۔ یہ ابن عمر کی روایت ہے کہ:

''حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا پروردگارا! ہمارے شام میں برکت عطا فرما اور ہمارے یمن میں برکت عطا فرما۔ لوگوں نے کہا یہ بھی فرما دیجئے کہ ہمارے نجد میں برکت عطا فرما۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر وہی دونوں جملے کہے کہ ہمارے شام میں برکت عطا فرما اور ہمارے یمن میں برکت عطا فرما۔ لوگوں نے کہا یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ اور ہمارے نجد میں بھی۔ راوی کا بیان ہے کہ مجھے خیال ہے کہ تیسری مرتبہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ وہاں تو زلزلے ہیں اور فتنے اور وہاں سے شیطان کا سینگ برآمد ہوگا''۔

اس حدیث سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرزمین نجد شیطان کے غلبے کا مرکز ہے، وہاں یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناپسند ہے۔ اس لئے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باوجود اصرار اُسے اپنی دُعائے خیر میں شامل نہیں کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمتِ خدا اس سرزمین سے ہمیشہ کے لئے دور ہے۔ یہ حدیث کتب اہلِ سنت میں بھی ہے جیسا کہ حوالہ آپ کے

سامنے آیا اور ہمارے علماء میں سے علامہ نوری نے بھی مستدرک الوسائل میں اُسے درج کیا ہے:

ان احادیث میں قرن الشیطان کی لفظ ہے جس کے لفظی معنی تو وہی ہوئے جو ہم نے ترجمے میں لکھے ہیں یعنی ''شیطان کا سینگ'' اس کے لئے ''قاموس'' میں ہے کہ قرن الشیطان اور قرنا الشیطان یعنی ''شیطان کے سینگ'' اور ''شیطان کے دونوں سینگ''۔ اس کے معنی ہیں اُس کا گروہ اور اس کی رائے کے پیرو یا اس کی طاقت اور اُس کا غلبہ و تسلط۔ گویا اہلِ مجد شیطان کے ہتھیاروں کی حیثیت رکھتے ہیں کہ اُنہی کے ذریعے سے وہ حملہ آور ہوتا ہے اور اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے۔

پھر ایک حدیث پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے کہ:

''ایمان مدینے کی طرف پناہ لیتا ہے''۔

اسے بن اثیر جزری نے نہایہ میں درج کیا ہے اور حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ:

''شیطان ناامید ہو چکا ہے کہ اب جزیرۃ العرب میں اُس کی عبادت نہیں ہوگی''۔

جس سے مکے اور مدینے کا مراد ہونا قدرِ متیقن کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ابن اثیر نے نہایہ میں امام مالک کا قول درج کیا ہے کہ یہاں ''جزیرۃ العرب'' سے خود مدینۂ منورہ مراد ہے۔ تو اس کے بعد کتنا تعجب خیز یہ تصور ہے کہ جس سرزمین کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شیطان کا مرکز کہا ہو، وہاں کے لوگ دعوے دار ہوں کہ ہم مومنین ہیں اور سچے مسلمان اور جن شہروں کے لئے فرمایا ہو کہ وہ ایمان کا مرکز ہیں اور وہاں شیطان کی پیروی اب نہیں ہو سکتی، انہیں سمجھا جائے کہ وہ سب کافر و مشرک ہیں۔

حیرت انگیز سخن پروری کا کرشمہ یہ ہے کہ مجدی حضرات آیاتِ قرآن اور بعض احادیث کی تاویل سے جو معقول وجوہ پر بھی مبنی ہو، شدت کے ساتھ انکار رکھتے ہیں اور انہیں اس

پر اصرار ہے کہ الفاظ کو اُن کے ظاہری مفہوم پر محمول کرنا چاہیے لیکن جب یہ حدیثیں پیش کی جاتی ہیں تو وہ انتہائی دور دراز تاویلوں سے کام لے کر دھاندلی کر کے بتاتے ہیں کہ اس سے سرزمین نجد مراد نہیں بلکہ سرزمین عراق مراد ہے۔ اس لئے کہ وہ حجاز سے اُونچی سطح پر واقع ہے۔ لیکن لغت اور جغرافیہ اور اشعار عرب سب پر نظر کرنے سے یہ بات بعید از حقیقت معلوم ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ نجد کی لفظ جب بلا کسی قید کے بولی جائے تو اُس سے یہی سرزمین مراد ہوتی ہے جو حجاز کے پاس اُس سے اُونچی ہے، اس لئے نجد کہلاتی ہے۔ اور اس کے مقابل میں تہامہ ہے اس لئے کہ وہ اُس سے نیچے ہے اور اُسے غور بھی کہتے ہیں، جو مقابل نجد ہوتا ہے۔

فیروز آبادی قاموس میں نجد کے معنی اور اُس کے حدود لکھتے ہیں کہ اُس کے آگے تہامہ اور یمن ہے اور اُس کے اِدھر اُدھر عراق اور شام ہے، اور حجاز کی طرف سے وہ ذات عرق سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ نجد عرب کے شہروں میں سے ہے اور وہ غور کے مقابل ہے اور غور سے مراد تہامہ ہوتا ہے اور تہامہ سے عراق تک بیچ میں جتنا اونچا حصہ ہے، وہ نجد ہے۔ اور فیومی نے "مصباح المنیر" میں لفظ نجد کی تشریح میں لکھا ہے کہ نجد مشہور ملک ہے سرزمین عرب میں سے عراق سے ملا ہوا اور وہ حجاز کا جزء نہیں ہے۔ اگرچہ جزیرۃ العرب میں داخل ہے۔ تہذیب میں ہے کہ جو خندق کسریٰ نے عراق کی سرحد پر کھدوائی تھی، اُس خندق کے آگے جتنا حصہ ہے، وہ نجد ہے، جہاں تک کہ حرہ کی طرف مڑو۔ جب اُس طرف مڑ جاؤ تو حجاز میں داخل ہو گئے۔

اور محمود شکری آلوسی نے تاریخ نجد میں تقریباً دس قول نجد کی حد بندی میں درج کئے ہیں جو سب کے سب اس بات کے شاہد ہیں کہ سرزمین عراق نجد سے خارج ہے۔

شعرائے عرب نے بھی نجد کی لفظ سے اسی سرزمین کو مراد لیا ہے، نہ کہ سرزمین عراق کو، بلکہ عراق کا نام نجد کے مقابلے میں لیا ہے۔ وہ اشعار ہم نے اپنی عربی کتاب میں درج کئے ہیں۔

اس اُردو کتاب میں اُن کے نقل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

"قاموس الامکنۃ والبقاع" میں ہے کہ "نجد کے شہر، حجاز کے مشرق میں واقع ہیں اور ان کے دو حصے ہیں: نجد حجاز اور نجد عارض اور اس سرزمین سے قرامطہ نے خروج کیا اور مسیلمۂ کذاب وہیں سے اُٹھا اور وہابی لوگ بھی وہیں سے برآمد ہوئے اور اُن کا پائے تخت شہر "ریاض" ہے جس کی مردم شماری تیس ہزار کی ہے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نجد کی سرزمین وہی ہے جو وہابیوں کا مرکز ہے اور یہ حجاز کے مشرق میں ہے جس کے بعد اُن احادیث کے مطلب پر کوئی پردہ نہیں رہتا۔

من جملہ اُن احادیث کے ایک وہ ہے جسے احمد بن زین دحلان نے "خلاصۃ الکلام" میں درج کیا ہے کہ:

"حضرت پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا نجد سے ایک شیطان ظاہر ہوگا جس کے فتنے سے جزیرۃ العرب میں تہلکہ پڑ جائے گا"۔

ایک اور حدیث اُنہوں نے یہ درج کی ہے کہ:

"مشرق کی طرف سے نکلیں گے ایسے جو قرآن اس صورت سے پڑھیں گے کہ وہ اُن کے گلوں کے آگے نہیں بڑھے گا۔ وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ وہ دین میں پھر واپس نہیں آئیں گے جب تک کہ تیر کمان میں واپس نہیں آتا۔ اُن کی خاص علامت سر منڈوائے ہونا ہوتا ہے"۔

اور ایسے ہی مضمون کی دوسری روایتیں بھی ہیں۔

خلاصۃ الکلام میں ان تمام روایتوں کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے یہ جو حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان کی خاص علامت سر کا گھٹوانا ہے۔ یہ صراحۃً اُس جماعت کو ظاہر کر رہا ہے جو مشرق سے نکلی اور وہ محمد بن عبدالوہاب کی پیرو ہے۔ اور ابن عبدالوہاب کی تاکید تھی کہ وہ سر کو اس

طرح گھٹوائیں کہ ذرا سا نشان بھی بال کا نہ رہ جائے اور کوئی آ جاتا تو اُسے اٹھ کر جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ جب تک کہ اُس کا سر منڈ نہ جائے۔ اور اتنی پابندی اس کی اس جماعت سے پہلے کسی بھی گروہ میں دیکھی نہیں گئی اور عبدالرحمن مفتی زبید کا قول تھا کہ ابن عبدالوہاب کی رد میں کسی کتاب کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ بس حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد کافی ہے کہ اس جماعت کی علامت سر کا منڈانا ہے۔ اس لئے کہ کسی بدعتی گروہ نے بھی کبھی اس پر اتنا زور نہیں دیا اور محمد بن عبدالوہاب کی طرف سے اس کی ایسی پابندی تھی کہ وہ عورتیں بھی جو اس مسلک کے پیرو ہوں، انہیں بھی سر کو منڈوانے کی ہدایت ہوتی تھی۔

منجملہ اُن کے ایک حدیث ہمارے بلند پایہ محدث علامہ مجلسیؒ نے "بحار الانوار کی جلد فتن میں ابو سعید خدریؓ کی روایت سے درج ہے کہ:

"حضرت علی علیہ السلام نے جبکہ وہ یمن میں تھے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کافی مقدار میں قیمتی سامان بھیجا تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے چار آدمیوں پر تقسیم کر دیا۔ اقرع بن حابس، عیینہ بن حصن فزاری اور علقمہ بن علاثہ عامری اور زید بن خیل طائی تو قریش اور انصار کو اس پر غصہ آیا اور کہنے لگے کہ یہ نجد کے بڑے بڑے آدمیوں کو دیتے ہیں اور ہمیں چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں تو میں تالیف قلب کے لئے دیتا ہوں۔ اس کے بعد ایک شخص آیا جس کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور پیشانی کی دونوں طرف کی ہڈیاں اونچی تھیں، ڈاڑھی گھنی تھی اور رخسار پھولے ہوئے تھے اور سر منڈا ہوا تھا۔ اس نے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لے کر پکارا اور کہا اللہ سے ڈریئے! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں اللہ کی نافرمانی کروں گا تو اس کی اطاعت کرنے والا کون ہوگا؟ وہ مجھ پر تمام دنیا

جہاں کے لوگوں کے بارے میں بھروسہ کئے ہوئے ہے اور تم لوگ مجھ پر بھروسا نہیں رکھتے ہو۔ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے جو میرا خیال ہے خالد بن ولید تھے، حضرت ﷺ سے اُسے قتل کرنے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے اجازت نہیں دی اور جب وہ چلا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اُس کی اصل نسل سے ایک گروہ وہ ہوگا کہ قرآن پڑھیں گیاس طرح کے اُن کے گلوں سے نیچے نہیں اُترے گا۔ وہ اسلام سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے، وہ مسلمانوں کو قتل کریں اور بت پرستوں کو چھوڑے رہیں گے۔ میں اگر اُن کو پاؤں تو قتل کروں اس طرح جیسے قبیلۂ عاد کے کسی آدمی کو قتل ہونا چاہیے''۔

دوسری روایت میں ہے کہ کسی نے پوچھا کہ اُن کی علامت کیا ہے؟ فرمایا: ''اُن کی علامت سر کا منڈوانا ہے، اس کے لئے ''تحلیق'' کی لفظ فرمائی یا ''تسمید'' کی تو جب اُنہیں دیکھنا، خوابِ مرگ کا مزہ چکھانا''۔

''نہایہ'' میں اس حدیث کے بعض اجزاء کے حل لغات میں لکھا ہے کہ: ''ضِضئی'' کے معنی ''اصل نسل'' کے ہیں اور ''تسمید'' اُن میں عام ہوگی۔ ''تسمید'' کے معنی سر منڈوانے کے ہیں۔ اس طرح کہ بال بالکل نیست و نابود ہو جائیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ شخص ذوالخویصرہ تمیمی تھا۔

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہیں:۔

ایک یہ کہ نجد والے ایسے مخالفین اسلام میں تھے کہ اُن میں سے جو دائرہ اسلام میں داخل ہوں، اُن کے لئے اُس طرح تالیف قلب کی ضرورت ہوتی تھی جیسے ابوسفیان وغیرہ کی جو ''موَلفۃ القلوب'' کہلاتے تھے۔

دوسرے ابوالخویصرہ تمیمی کے لئے یہ فرمایا ہے کہ اس کی اصل نسل سے ایسے لوگ ہوں گے اور ابن عبدالوہاب کا تمیمی ہونا پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ اس لئے یہ ثابت ہوا کہ یہ سب علامات اس جماعت میں وہی ہیں جن کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا تھا۔ مسلمانوں کا خون بہانا، غیر مسلم بت پرستوں کے خلاف کبھی تلوار نہ اُٹھانا، سروں کا گھٹا رکھنا، یہ سب اُمور مشاہدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُمی سے آدمی اُن اوصاف کو سمجھ سکتا ہے جو آنکھ سے دیکھنے کے نہیں ہیں۔ جیسے قرآن کا گلے کے نیچے نہ اُترنا اور اسلام سے اس طرح خارج ہونا جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔

ایسی ہی اور حدیثیں تلاش سے مل سکتی ہیں جو بالکل نجدی حضرات پر منطبق ہیں اور جنہیں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ بھی سمجھنا چاہیے۔

ساتواں باب

وہابیوں کے کرتوت ابتداء سے دورِ حاضر تک

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لوگ ۱۱۶۰ھ میں ظاہر ہوئے اور جب سے سامنے آئے صرف مسلمانوں کی خوں ریزی ان کا شعار رہی اور اُن کے اس وقت کے حاکم محمد بن مسعود نے محمد بن عبدالوہاب سے بیعت اسی پر کی تھی کہ وہ اُس مسلک کے مخالفین سے جنگ کرے گا۔ اور ''راہِ خدا میں جہاد'' کے نام سے اُن کا خون بہائے گا۔ تو اب ایسی جماعت کا پوچھنا کیا جس کے مذہب کی بنیاد ہی مسلمانوں کے خون بہانے پر ہو، تو جتنا ان کا اقتدار مضبوط ہوتا جائے، انہیں اس امر سے کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے جتنی جتنی اُن کے اقتدار میں مضبوطی پیدا ہوئی، ان کی خونریزی میں اضافہ ہوتا گیا۔ علاوہ خون بہانے کے کتنے ہی ناموسوں کی بے حرمتی ہوئی، کتنی عورتوں کو قید کیا اور انہیں کنیز بنایا۔ کتنے ہی بچوں کو قتل کیا اور یہ تمام مظالم مسلمانوں پر ہوئے اور اپنے اقتدار کی پوری عمر میں اُنہوں نے غیر مسلم آدمیوں میں سے کسی کا خون نہیں بہایا۔

جب نجد کے جاہلوں میں اُن کا سکہ بیٹھ گیا تو اُن کے مظالم و تعدی کا قدم آگے بڑھا اور سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن مسعود کے دور میں کئی مرتبہ عراق پر حملہ کیا۔ چنانچہ بزرگ مرتبہ شیعہ عالم سید محمد جواد عاملی نے اپنی کتاب ''مفتاح الکرامہ'' میں ضمان اور شفعہ اور وکالہ کی جلدوں کے آخر میں ان مظالم کا چشم دید تذکرہ کیا ہے اور اسی زمانے میں یہ حرمین شریفین میں داخل ہوئے اور شریفِ مکہ اور اُن میں ۱۲۰۵ھ سے ۱۲۲۰ھ تک مسلسل جنگ ہوئی جس میں شریفِ مکہ کو شکست ہوئی اور انہوں نے حرمین شریفین کو ''دار الحرب'' قرار دے کر وہاں قتل و

غارت کا بازار گرم کیا اور حجرۂ نبوی میں جتنے اموال اور جواہرات تھے سب لوٹ کر انہیں اپنی مرضی سے صرف کر ڈالا۔ اس کا تفصیلی ذکر "عجائب الاثر" جبرتی میں ہے۔ حالانکہ مختلف مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مصنف خود وہابیت کی طرف میلان رکھتا تھا اور مسلمانوں کو حج سے روک دیا اور موسم حج میں اعلان کیا گیا کہ اے صاحبانِ ایمان مشرکین نجس ہیں تو وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ آئیں۔ یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۲۲۱ھ سے شام و مصر کے حاجیوں کا آنا بند ہو گیا جس کا ذکر خلاصۃ الکلام احمد بن زینی دحلان میں موجود ہے۔

اور ۱۲۲۳ھ میں اُس وقت کے ابن مسعود نے مکے والوں سے کہا کہ قبے جتنے ہیں، وہ گرا دیے جائیں اور ان بتوں کو ختم کیا جائے تاکہ سوا اللہ کے کوئی معبود نہ رہے چنانچہ دوسرے دن لوگ پھاوڑے لیے ہوئے اِدھر اُدھر متبرک آثار اور قبوں کو گرانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ چنانچہ سب سے پہلے جنۃ المعلیٰ کے قبے گرائے جو بڑی تعداد میں تھے۔ پھر مولد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مقام ولادت ابوبکر اور مزار جناب خدیجہؓ کے قبے گرائے۔ اور تمام ان مقامات کو مسمار کیا جو آثار مقدسہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور وہ گراتے وقت رجزیں پڑھ رہے تھے اور ڈھول بجا رہے تھے، اور گا رہے تھے اور اہل قبور کو گالیاں دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ سب وہ معبود ہیں جو لوگوں نے تراشے ہیں۔ اس سب کا ذکر علامہ ابن دحلان نے اپنی تاریخ "خلاصۃ الکلام" میں کیا ہے۔

اسی طرح مدینے کی قبروں کو منہدم کیا گیا سوا قبۂ نبوی کے اس کے علاوہ تمام قبور مقدسہ اور آثار متبرکہ کو خصوصیت کے ساتھ جنت البقیع کے مزارات کو منہدم کیا۔ یہ اُن کے حرکات برابر جاری رہے، یہاں تک کہ مصر کی فوجیں آئیں اور انہوں۔ نے ان کو یہاں سے نکلنے پر مجبور کیا اور اس سلسلے میں جنگ بڑی شدت سے جاری رہی۔ یہاں تک کہ بالآخر نجدی فوج کو شکست ہوئی اور مسلمانوں کا لشکر فتحیاب ہوا اور شعبان ۱۲۳۳ھ میں محمد علی پاشا حاکم مصر کا حکم نجد میں مصری فوج کے سالار ابراہیم پاشا کے پاس پہنچا، جو درعیہ تک پہنچ چکے تھے کہ شہر درعیہ کو مسمار کر دیں چنانچہ

مصری فوج نے تیزی کے ساتھ اس شہر کو مسمار کر دیا اور آگ لگا دی اور وہاں کے باشندے سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے، لیکن حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے خوارج کے لئے پہلے ہی خبر دی تھی کہ یہ بالکل ختم کبھی نہیں ہوں گے۔ جب ایک شاخ ان کی قطع ہو گی، دوسری شاخ برآمد ہو جائے گی، چنانچہ کچھ مدت گذرنے کے بعد پھر اُنہوں نے سر اٹھایا۔

پھر عراق آئے اور کربلائے معلی میں شہر کے اندر داخل ہو کر ہزاروں مومنین کو تہ تیغ کیا اور حرم اقدس کی توہین کی۔ بالکل اُسی طرح جیسے مسلم بن عقبہ یزیدی فوج کے افسر نے معرکہ حرہ کے بعد حرم مدینہ کے اندر کیا تھا کہ وہاں نجاستوں کا انبار کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ضریح اقدس کو اکھاڑ ڈالا اور جو کچھ حرم اقدس کا خزانہ تھا، سب لوٹ لیا۔ بس نجف اشرف میں داخل نہیں ہو سکے حالانکہ کئی دن تک وہاں محاصرہ رکھا مگر قدرت کی طرف سے انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور بہت سے آدمیوں کے اتلاف جان کے بعد وہ نامراد واپس ہوئے۔

اس کے بعد تقریباً ایک صدی تک وہ زیادہ سر نہیں اٹھا سکے۔ بس اپنے نجد کے شہروں میں محدود رہے۔ یہاں تک کہ اب آخر میں انگریزوں کی بدولت اُنہیں آگے بڑھنے کا ایسا موقع ملا کہ نجد کا حاکم سلطان نجد و حجاز اور والی حرمین ہو گیا۔ اور اب انہوں نے وہ ظلم و ستم کیا اور شعائر الٰہی کی بے حرمتی کی جس سے اسلام اور مسلمانوں کے دلوں میں گھاؤ پڑ گئے ہیں۔ اس وقت کے عبد العزیز آلِ سعود نے برسر اقتدار آ کر پہلے تو طائف میں قتلِ عام کیا اور ترجمان القرآن، امام المفسرین خیر الامۃ عبد اللہ بن عباسؓ کے قبے کو منہدم کیا۔ پھر مکہ معظمہ میں جتنے قبے تھے، سب کو گرایا جن میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدِّ امجد جناب عبد المطلب کا قبہ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمِّ نامدار جناب ابو طالب علیہ السلام قبہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجۂ طاہرہ اُم المومنین جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا کا قبہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مادرِ گرامی جناب آمنہ بنت وہب کا قبہ، ان سب کو مسمار کر دیا۔

ان حضرات کے ذاتی فضائل و مراتب کے علاوہ اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ ان

میں سے اکثر سر برآوردہ قبیلۂ قریش کے افراد تھے جن کے بارے میں خود ان نجدیوں کے پیشوا امام احمد بن حنبل کے سند میں حدیث ہے کہ:

''حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قریش کی توہین کی، اُس کی خدا توہین کرے گا''۔

اور اس میں کچھ شک نہیں ہو سکتا کہ قبر کا مسمار کرنا صاحب قبر کی توہین ہے۔ اور حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ایک قبر سے تکیہ لگائے بیٹھا ہے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قبر کو اذیت نہ پہنچاؤ اور ابن ابی شیبہ نے عبد اللہ بن مسعود سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا مومن کو اذیت دینا اُس کی موت کے بعد مثل اذیت دینے کے ہے اُس کی زندگی میں اور ہمیں انہوں نے مومن کو ایذا پہنچانے سے ممانعت کی ہے۔ اب ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ کسی کا گھر گرا دیا جائے تو زندگی میں اُسے اذیت ہو گی یا نہیں؟ تو اسی صورت سے قبر پر پھاوڑے چلائے جائیں تو یقیناً اس میت کو ایذا ہو گی جس کی وہ قبر ہے اور جب یہ اصحاب قبور کو ایذا پہنچاتا ہے تو اب قرآن کی یہ آیت پڑھیئے کہ:

''جو لوگ مومنین اور مومنات کو بلا جرم و خطا ایذا پہنچائیں اُنہوں نے بڑے گناہ کا بوجھ اٹھایا''۔

طائف اور مکہ معظمہ میں اُن کے یہ افعال مسلمانِ عالم میں بے چینی پیدا کرنے کے لئے کافی تھے کہ پھر مدینہ منورہ کے تمام مآثر و آثار مقدسہ کو منہدم کیا اور جنت البقیع کے تمام قبروں کو مسمار کیا جن میں ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اقربائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبریں تھیں جیسے عثمان بن مظعون جنہیں خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دفن کیا تھا اور اُن کی قبر کے نمایاں کرنے میں اہتمام فرمایا تھا جس کا ذکر اس کتاب میں پہلے ہو چکا ہے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد بزرگوار جناب عبد اللہ اور حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند جناب ابراہیم علیہ السلام اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے چچا عباس بن عبد المطلب اور چچازاد بھائی جناب عقیل اور صحابی عبد اللہ بن مسعود اور عبد الرحمن بن عوف وغیرہ اور سب سے بڑھ کر حضرت خاتون جنت جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا مزار مبارک جہاں بہت سے علمائے اہل سنت جیسے مومن سبلنجی ''نور الابصار'' میں اور محمد بن صبان ''اسعاف الراغبین'' اور ابو العباس احمد بن یوسف دمشقی ''اخبار الدول'' اور ''آثار الاول'' میں اور علی بن برہان الدین شافعی ''انسان العیون'' میں اور عبد البر ''کتاب الاستعیاب'' میں اور دوسرے مصنفین حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی قبر ہونے کے قائل ہیں جن کے لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاف حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے کہ:

''جس نے ان کو اذیت پہنچائی اُس نے مجھے ایذا پہنچائی''۔

اور یہ حدیث پہلے آچکی ہے کہ:

''جو بعد موت ایذا پہنچائے، وہ ایسا ہی ہے جیسے زندگی میں ایذا پہنچائے''۔

تو اس کے بعد قرآن کی یہ آیت پڑھنا چاہیے جس کا مضمون یہ ہے کہ:

''جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا پہنچاتے ہیں، اُن پر اللہ کی لعنت ہے دنیا اور آخرت میں اور اُن کے لئے بہت بڑا عذاب ہے''۔

اس سب کے علاوہ اُس قبے کو منہدم کیا جس میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام میں سے چار ہستیاں:

۱۔ سبط اکبر حضرت امام حسن علیہ السلام

۲۔ زین العابدین امام علی بن الحسین علیہ السلام

۳۔ باقر العلوم الاولین والآخرین امام محمد بن علی علیہ السلام

۴۔ صادق آل محمد امام جعفر بن محمد علیہ السلام

یہ سب حضرات مدفون تھے جن کے مناقب وفضائل معتبر کتب اہل سنت میں بھی موجود ہیں اور یہ قبہ جس میں یہ حضرات دفن تھے، تمام مسلمانوں کے نزدیک خاص احترام وتقدس رکھتا

تھا۔ چنانچہ علامہ ابن حجر کی صواعق محرقہ میں لکھتے ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے حال میں کہ:

"آپ بھی اس قبے میں دفن ہوئے تو کیا کہنا اس قبے کا کتنا بزرگ مرتبہ اور متبرک اور شریف ہے"۔

اور محدث پارسا بخاری نے "فصل الخطاب" میں امام زین العابدین علیہ السلام کے حال میں لکھا ہے کہ:

"آپ اس قبے میں دفن ہوئے جس میں اس سے پہلے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباس اور خود آپ کے چچا امام حسن علیہ السلام دفن ہو چکے تھے۔ اور آپ کے بعد اس میں آپ کے فرزند محمد باقر علیہ السلام اور پھر ان کے بیٹے جعفر صادق علیہ السلام دفن ہوئے تو کیا کہنا اس قبے کا کہ کتنا بزرگ اور صاحب شرافت یہ قبہ ہے"۔

ایسے ہی اور علماء کے کلمات بھی ہیں۔

اور اس قبے کے انہدام سے بلا تفریق شیعہ و سنی مسلمانوں کو کتنا رنج پہنچا، اس کا اندازہ خواجہ حسن ثانی نظامی کے حسب ذیل تاثرات سے ہو سکتا ہے، جو انہوں نے ماہنامہ "منادی" نئی دہلی کے دسمبر ۱۹۶۸ء کے شمارے میں "ایران و عراق کے زیارت نامے" میں روضۂ امام رضا علیہ السلام کے حالات درج کرنے کے بعد لکھے ہیں:

"یہاں کے کیفیات کے ساتھ مدینۂ منورہ کا تصور بندھ جاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے بقیع کا قبرستان آجاتا ہے۔ سب شکستہ، سب بے سایہ، نہ گنبد، نہ قبر پوش، نہ پھول، نہ کسی درخت کی چھاؤں، نہ گھانس کی روپٹیاں"۔

میری عقل حیران ہے کہ جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجرے میں آرام فرما سکتے ہیں، جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آرام گاہ بن گنبد بن سکتا ہے۔ جب حضرت ابوبکر اور حضرت عمر حجرے میں مدفون ہو سکتے ہیں او ان کو وہاں دفن کرنے والے صحابہ، وہ صحابہ جنہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں

دیکھیں۔ جنہوں نے اسلام کو اسلام لانے والے سے براہ راست سیکھا، ان میں سے کوئی بھی حجروں کے اندر، عمارتوں کے نیچے، دفن ہونے میں کوئی برائی نہیں دیکھتا تھا تو پھر آج مقبروں کو ڈھانے اور مسمار کرنے کا حق کسی کو کیسے پہنچ جاتا ہے؟ کیا یہ قبر شکن صحابہ سے زیادہ دین کو سمجھ سکتے تھے؟ خاکم بدہن کیا صحابہ کرام ان لوگوں کے مقابلے میں کم دیندار تھے؟ نعوذ باللہ من ذلک"۔

بات اصل میں یہ ہے کہ خیر و شر اور حق و ناحق کا مقابلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

مکہ اور طائف کی ایذا رسانیاں،

بدر و اُحد کی چڑھائیاں،

صفین و کربلا کے معرکے،

سلسلہ در سلسلہ آج بھی موجود ہیں، محمد اور محمد والوں کو (علیہم السلام) دنیا کی آزمائش گاہوں میں ہر طرح صبر و ثبات کا نمونہ دکھانا ہے۔ جب بھی دکھایا، اب بھی دکھا رہے ہیں۔

اللہ مدینہ کے سبز گنبد کو سلامت رکھے، اگر اس کا بننا اور سلامت رہنا جائز ہے تو کیا اس دکھ کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے جو اس سبز گنبد کے مکین کو اپنی لاڈلی اکلوتی بیٹی فاطمہ، اور اپنے چہیتے نواسے حسن اور دوسرے کتنے ہی پیاروں کی شکستہ قبروں اور بے سایہ مزاروں پر ہوتا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اُس دن کی صبح کسی مسلمان کو نصیب نہ کرے جس دن اُس کے قول و فعل سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھ پہنچے"۔

تمام شد

علی نقی النقوی

(تہران) جمہوری اسلامی ایران

کتابیات

خلافت وامامت

تاریخ نجد

التوحید الذی ھو حق اللہ علی العبید — ابن عبدالوہاب

مسلم

بخاری

نہج البلاغہ

جوہر منظم فی زیارۃ قبر النبی المکرم — علامہ ابن حجر مکی

اشرف الوسائل الی فہم الشمائل — علامہ ابن حجر مکی

حل المعاقد حاشیہ شرح عقائد۔ — مولانا عبدالحلیم فرنگی محل

درر کامنہ۔ جلد اول۔ — علامہ ابن حجر مکی

تاریخ ذہبی

مراۃ الجنان یافعی

تاریخ ابوالفداء

خلاصۃ المقاتل فی شد الرحال — سید مصطفی نورالدین حسین

انسان العیون — علی بن برہان الدین شافعی

شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام — قاضی القضاۃ شیخ حافظ تقی الدین سبکی

منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال۔ — مفتی صدرالدین

اتحاف اھل العرفان برویۃ الانبیاء والملائکۃ والجان۔ شیخ محمد برنسی

نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض	احمد بن شہاب الدین خفاجی
شرح شفاء	ملا علی قاری
کشف الظنون	
مستدرک	حاکم
معجم کبیر	طبرانی
اوسط	طبرانی
حلیۃ الاولیاء	ابو نعیم
جامع کبیر	حافظ سیوطی
خصائص کبریٰ	جلال الدین سیوطی
دلائل بیہقی	
تاریخ بخاری	
کتاب المعرفۃ	ابو نعیم
شرح دلائل الخیرات	
بہجۃ المحافل	عماد الدین عامری
دلائل النبوۃ	حافظ ابو نعیم اصفہانی
البیان والتبیین	جاحظ
أسد الغابہ	ابن اثیر جزری
استیعاب	ابن عبد البر
زاد المعاد	ابن قیم
تاریخ ابن خلکان	

سنن ابن ماجہ	
حاشیہ سنن ابن ماجہ	محدث سندی
مواہب لدنیہ	قسطلانی
حصن حصین	علامہ شمس الدین جزری
جذب القلوب	شاہ عبدالحق محدث دہلوی
شفاء	قاضی عیاض
اوراق بغدادیہ	سید ابراہیم راوی رفاعی
وفاء	سمہودی
تذکرۃ السامع والمتکلم	شیخ بدرالدین بن ابراہیم بن سعد اللہ بن جمعائی کنعانی
ادب الاملاء والاستملا	عبدالکریم سمعانی
محاضرۃ الابرار	شیخ محی الدین ابن عربی
اصابہ	حافظ ابن حجر
حاشیہ اقام	شیخ منصور حنبلی
محاضرۃ الاوائل	
جمع بین الصحیحین	
مسند احمد	
سنن ابن داؤد	
تاریخ نجد	آلوسی
تفسیر کبیر	امام فخر الدین رازی

کتاب العالم والمتعلم	امام ابوحنیفہ
جامع کبیر	جلال الدین سیوطی
عمل الیوم واللیلۃ	حافظ ابونعیم اصفہانی
کتاب الدعوات	حافظ جلال الدین سیوطی
خیرات حسان فی مناقب الامام ابی حنیفۃ النعمان ابن حجر عسقلانی	
بانی درس نظامی	مفتی محمد رضا انصاری
فتوئی جواز یا شیخ عبدالقادر شیئاللہ	
ینابیع المودۃ	شیخ سلیمان بلخی قندوزی
کفایہ شعبی	
فتاوای غرائب	
مطالب المومنین	
خزانۃ الروایۃ	
ابجد العلوم	نواب صدیق حسن خان قنوجی
محوالحوبۃ فی شرح ابیات التوبۃ	محمد بن اسماعیل صنعانی
ردالمحتار	سید محمد امین بن عمر معروف یابن عابدین
توضیح	سلیمان بن عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب
الحصن والجنۃ علی عقیدۃ اہل السنۃ	شیخ محمد یوسف مشہور بہ لقب کافی
شرح التوحید	
کشف الشبہات فی التشکیک بالشابہات	محمد بن عبدالوہاب
کشط الاباب	

زاد المعاد فی حدی خیر العباد	ابن قیم
کتاب الام	شافعی
وفاء الوفاء	
صواعق المحرقۃ	علامہ ابن حجر مکی
اوراق بغدادیہ	
معالم التنزیل بغوی	
لباب التاویل	خازن
تفسیر جلالین	
کشاف	
ابو السعود	
تنویر المقباس	ابن عباس
غرائب القرآن	نیشاپوری
شرح صحیح مسلم	نووی
صراط مستقیم	شیخ تقی الدین ابن تیمیہ
العدل الشاہد فی تحقیق المشاہد	عثمان بن بدوخ شافعی
فصل الخطاب	محدث خواجہ پارسا بخاری
رسالہ ام القریٰ	۴ جمادی الثانی ۱۳۴۵ھ عبداللہ ابن سلیمان
عمدۃ الطالب	جمال الدین ابن عنبہ
حبیب السیر	
کامل ابن اثیر	

روضۃ الصفاء	
تاریخ الخلفاء	سیوطی
در المختار	
شرح مشکوۃ	
مجمع البحار	محدث محمد طاہر فتنی
وسائل الشیعہ	شیخ حر عاملی
مصباح المنیر	فیتونی
تفسیر روح المعانی	
زہر الربی	حافظ سیوطی
تفسیر بیضاوی	
حاشیہ سنن نسائی.	علامہ سندی مدنی
کنوز الحقائق	مناوی
فتح الباری	
احیاء العلوم	غزالی
نہایہ	ابن اثیر
الاعلام بالاعلام فی بیت اللہ الحرام	
تحفۃ الباری	
ارشاد الساری	قسطلانی
علامہ سید حسن صدر طاب ثراہ	
کتاب العلل والسوالات	عبد اللہ ابن احمد بن حنبل

علامہ محقق کمال بن ہمام	
مستدرک الوسائل	علامہ نوری
صحاح جوہری	
تہذیب	
قاموس الامکنہ والبقاع	
خلاصۃ الکلام	احمد بن زینی دحلان
بحارالانوار	علامہ مجلسی
مفتاح الکرامہ	سید محمد جواد عاملی
تاریخ عجائب الاثر	جبرتی
نورالابصار	مومن شبلنجی
اسعاف الراغبین	محمد بن حیان
اخبار الاول	ابوالعباس احمد بن یوسف دمشقی
آثار الاول	ابوالعباس احمد بن یوسف دمشقی
کتاب الاستیعاب	ابن عبدالبر
رسالہ منادی	ماہ دسمبر ۱۹۶۸ء خواجہ حسن ثانی۔ نئی دہلی

کشف النقاب

کشف النقاب
کشف النقاب
کشف النقاب
کشف النقاب

